آپ بیتی

ذاتِ بے مثال

مصنف

پادری جے۔ آر۔ رچرڈ

ناشر

ایم۔ آئی۔ کے ۳۶ فیروز پور روڈ لاہور

بار	.....	اول
تعداد	.....	دو ہزار
اشاعت	.....	۱۹۹۵ء
قیمت	.....	۶ روپے

مینجر ایم ۔ آئی ۔ کے ۳۶ فیروز پور روڈ لاہور نے طفیل آرٹ پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کیا۔

باب اول

کیا یہ وہ بڑھئی نہیں؟

نام بہت دلچسپ حقائق کے حامل ہوتے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ کئی بار کسی جگہ کی تاریخ اس کے نام سے منعکس ہوتی ہے۔ لیکن شخصی ناموں کا مطالعہ تو اور بھی دلچسپ ہوتا ہے کیونکہ کسی فرد کا نام اس سے متعلق کئی ایک حقائق ہم تک پہنچاتا ہے۔ اس سے ہمیں اس کی قومیت اور مذہب کا پتہ چلے گا اور غالباً اس کے وقت پیدائش اور جنم بھومی کا سراغ بھی ملے گا۔ فی الحال ہم صرف شخصی ناموں کی مذہبی اہمیت پر غور کریں گے کیونکہ اس باب کے موضوع کا تعلق اسی سے ہے۔

جب ہم مراکش، ایران، بھارت اور البانیہ جیسے دور دراز ممالک میں محمدؐ بطور شخصی نام استعمال ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس خطے کی وسعت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جہاں تک دین اسلام پہنچ چکا ہے۔ اس سے ہم پر یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کے لئے اپنے دلوں میں کتنی عزت و احترام رکھتے ہیں۔ یہ انسانی خواہش ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی اہم مذہبی اور قومی شخصیات کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھتا ہے۔

اسی طرح ابرہام، یعقوب، اضحاق، اور موسیٰ بعض مسیحی حلقوں کے علاوہ

یہودیوں میں نہایت مقبول نام ہیں جبکہ پیٹر' پال' جیمس' اینڈریو اور جان تمام مسیحی ممالک میں بہت مشہور و پسندیدہ نام ہیں۔ لیکن یسوع نام کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟

کسی زمانے میں اس نام کی عبرانی صورت یشوع یہودیوں میں بڑی مقبول تھی۔ پہلی صدی عیسوی کا یہودی مورخ یوسیفس ذکر کرتا ہے کہ اس نام کے بیس آدمی ہو گزرے ہیں جن میں سے دس تو یسوع ناصری کے ہمعصر تھے۔ کسی دور میں یہ بہت پسندیدہ شخصی نام تھا مگر اب یہودیوں میں یہ ناپید ہو گیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ یہ ان کے ایک عظیم قومی ہیرو (یشوع) کا نام تھا' اب کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جس کا یہ نام ہو۔ قرآن مجید میں اسے موسیٰ کے وزن پر عیسیٰ لکھا گیا ہے اور تمام اسلامی دنیا میں یہ نام آج بھی اسی شکل و صورت میں عام ہے۔ لیکن مسیحیوں میں خال خال ہی یہ بطور شخصی نام ملتا ہے' البتہ کئی ممالک میں یہ اضافی یا مخلوط نام کی شکل میں پایا جاتا ہے' تاہم شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ یہ نام یہودیوں کے نزدیک اتنا قابل نفرت بن چکا ہے کہ وہ اس کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں۔ اہل اسلام اس کا بہت احترام کرتے ہیں لہٰذا ان کے درمیان اس نام کو کافی مقبولیت حاصل ہے' جبکہ مسیحی اسے مقدس خیال کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ وہ یہ نام استعمال کریں۔ اب ہم یہ استفسار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ یسوع کون تھا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایک دیہاتی بڑھئی کے طور پر بسر کیا۔

یوں تو ہر دور میں عظیم انسان پیدا ہوتے رہے ہیں مگر یہ یسوع منفرد شخصیت کا مالک ہے۔ اس دیہاتی بڑھئی نے اپنی ورکشاپ کو خیرباد کہا اور اپنی زندگی کے آخری تین سالوں میں نسل انسانی پر اپنی لاثانی ذات کے ایسے دائمی اثرات مرتب کئے کہ اس دنیا میں انقلاب برپا کر کے ایک نئے تاریخی دور کی بنیاد رکھی۔

آپ کہیں بھی چلے جائیں اسے اپنے ذہن سے اتار نہیں سکتے کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی ذات کے اثر کے ظاہری نشانات بڑے واضح ہیں۔ ہر قوم کے اپنے ہیرو ہوتے ہیں اور ہر ہیرو کی یادگاریں ہوتی ہیں مگر اپنی قوم اور لوگوں کا ٹھکرایا ہوا یسوع نامی یہ شخص کسی یادگار کا محتاج نہیں۔ مغرب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا بہت سا اعلیٰ ترین فن تعمیر' بہترین آرٹ' عمدہ ترین موسیقی اور ادب کے شاہکار ----- ان سب کا ماخذ و منبع یسوع کی شخصیت ہے۔ یسوع سخت اوزاروں سے کام کرنے والا محض ایک دیہاتی بڑھئی تھا جس نے غالباً نہ کبھی مصوری دیکھی تھی اور نہ کبھی موسیقی کے سازوں کو باہم بجتے ہی سنا تھا۔ تاریخ عالم کے سٹیج پر ان گنت عظیم ہستیاں نمودار ہوئیں اور اپنی تصانیف چھوڑ کر ملک عدم کو سدھار گئیں۔ ان کی چھوڑی ہوئی تحریریں بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے ایک بیش قیمت ورثہ بن چکی ہیں۔ لیکن جب ہم ان تمام کا موازنہ یسوع سے کرتے ہیں جس نے کوئی کتاب نہ لکھی' تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مقابلتاً" انہوں نے دنیا پر بہت کم اثر چھوڑا۔ اگر آپ ان تمام کتب پر غور فرمائیں جنہوں نے دنیا کی سوچ و

فکر کو جلا بخشی، جنہوں نے زبانوں کی آبیاری کی اور نسل در نسل قوموں اور بادشاہوں کا نہایت قیمتی اثاثہ بن چکی ہیں ----- تو ان میں نمایاں ترین کتاب وہ ملے گی جو اس شخص کے متعلق لکھی گئی ہے جس نے خود کوئی کتاب قلم بند نہیں کی تھی۔

یسوع کے ملک فلسطین کے علاقے گلیل میں چلتے پھرتے بیس صدیاں بیت چکی ہیں، ترقی و خوشحالی اور نت نئی اختراعات و ایجادات کا دور آگیا، مگر اس کے باوجود اس کا اثر جوں کا توں قائم ہے۔ اب تک لوگ اسی میں اپنے دل کی تسلی و تشفی پاتے ہیں۔ وہ نہ کسی یونیورسٹی کا فارغ التحصیل تھا اور نہ اس نے سکولوں اور کالجوں سے موجودہ دور جیسا جدید علم ہی حاصل کیا تھا، تو بھی اس کے بغیر جدید دنیا کا تمام علم بے کار اور فضول ہے۔ ایک عرصے تک تو ایسا لگتا رہا کہ سائنس انسان کو خدا سے دور کر کے اس کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دے گی کہ وہ خدا کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرے گا۔ مگر اب پھر حالات میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور وہ شخص جو آج خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے اسے جدید سائنسی حقائق کو سمجھنے میں دقت پیش آئے گی۔ کائنات کے خالق کے وجود کے قائل شخص کے لئے اس کے سربستہ بھیدوں کو سمجھنا اس کی نسبت قدرے آسان ہے جو کہ مخلوقات کے تخلیق کار کا منکر ہے۔

سائنس کا دارومدار فقط مشاہدات و تجربات پر ہے۔ یہ خدا کے وجود کی طرف اشارہ تو کر سکتی ہے مگر اسے ثابت نہیں کر سکتی۔ فلسفہ طبعی سائنس سے بالاتر ہو کر اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم نہ سائنس اور نہ

فلسفہ ہی انسان کے دل کی تسکین کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ انسان کو خدا کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں صرف یسوع ہی اس کی مدد کر سکتا ہے۔ بیسویں صدی کا ایک عظیم سائنس دان سر اے۔ ایس۔ ایڈنگٹن کہتا ہے "اگر خدا کے متعلق یسوع کی تعلیم درست اور راست نہیں تو پھر خدا کے وجود کے بارے میں تمام نظریات بے معنی ہیں۔" حالات کے ساتھ ساتھ ہر چیز تبدیل ہو رہی ہے۔ کوئی سچائی بھی حتمی اور اٹل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی، مگر یسوع کی تعلیمات کو زوال نہیں ------ اور وہ ایک دیساتی بڑھئی تھا!

اس کا اثر اور کہیں اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ انسانی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں۔ تاریخ کے صفحات پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ انسان نے دوسرے انسانوں سے کیا سلوک روا رکھا۔ اٹھیں اور ان کھنڈرات پر نظر ڈالیں جو قدیم تہذیبوں کی عظمت کے گواہ ہیں۔ عبادت گاہوں، اہرام مصر اور مقبروں کو بنظر غور دیکھیں، آپ اگلے زمانے کے بادشاہوں کی شان و شوکت پر حیران رہ جائیں گے۔ لیکن آپ کے ذہن میں شاید ہی عوام، انسانی زندگی کی ارزانی، کوڑوں کی ضربیں، لہولہان پیٹھیں اور پیروں تلے کچلی جانے والی لاشوں کا خیال آئے جو ان پرشکوہ عمارات کی نذر ہو گئیں۔ دارا اور اخسویرس جیسے عظیم ایرانی شہنشاہوں کے رتھوں کے پہیوں کے دھروں کی میخیں انسانی شکل کی ہوتی تھیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں عوام الناس کس قدر غلامی میں پس رہے تھے اور انسانی زندگی کتنی سستی تھی۔ قدیم زمانے میں غلامی کا عام رواج تھا اور اسی بنیاد پر تمام معاشرتی زندگی کی عمارت قائم تھی۔ عبرانی نبی یرمیاہ نے

پہچان لیا کہ ہر شخص واحد بہت قیمتی ہے۔ یہودیت اور یونانی فلسفے نے بھی اس معاشرے میں ترقی کی منازل طے کیں جس نے غلامی کو قبول کر لیا ہوا تھا۔ پھر افلاطون نے جس کے دل میں راست بازی کی بڑی بھوک و پیاس تھی ایک ایسے مثالی معاشرے کی تصویر پیش کی جس میں ہر شخص کو آزادی حاصل تھی۔ تاہم ہمیں کہیں سے اس بات کا سراغ نہیں ملتا کہ اس نے اپنے گردوپیش کی غلامی کے خلاف آواز اٹھائی ہو یا معاشرے کو اس بات پر حیران کر دیا ہو کہ عورتوں اور غلاموں سے ایسا سلوک کیا جس سے ظاہر ہو کہ خدا کے نزدیک تمام انسان ایک جیسا مقام رکھتے ہیں۔

بے شک ان دنوں میں غلامی ایک ٹھوس حقیقت تھی' تاہم گردش ایام کے ساتھ ساتھ لوگوں میں ایک تبدیلی رونما ہوتی گئی جو خمیر کی طرح آہستہ آہستہ اور مخفی طور پر لوگوں کے دلوں کو بدلتی گئی اور یوں ایک شخص میں دوسرے کے لئے ایک نیا رویہ پیدا ہوتا گیا۔ یہ اثر ایک دیہاتی ترکھان یسوع ناصری کے ذریعے اس دنیا میں آیا جس نے انسانیت کو نئے معنی عطا کئے اور خدا کی نگاہ میں اس کی قدر و قیمت کا ثبوت فراہم کیا۔ سوائے اس کے اور وہ جنہوں نے اس کی ذات میں سچائی کا مشاہدہ کیا کوئی بھی انسان کے مقام سے آگاہ نہیں تھا۔ بے شک ہر زمانے میں اور ہر خطے میں نیک بندے جنم لیتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی خدا کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ تاہم جتنا انہوں نے خدا کے بارے میں زیادہ سوچا اتنا ہی انہوں نے انسان کو کم اہمیت دی۔ چنانچہ صوفی فنافی اللہ کی منزل کے حصول کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔

نظریہ وحدت الوجود جو تصوف کی بنیاد ہے انسانی ذات کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے گویا کہ وہ ایک فریب نظر، بے قدر چیز، ناپائیدار ظہور اور محض ایک الٰہی عکس ہو۔ لیکن یسوع کی تعلیم نے ایک حقیر ترین غلام کو بھی یہ احساس دلایا کہ خدا کی نظر میں اس کی بھی بڑی قدر و منزلت ہے۔ وہ تعلیم جس کا آغاز یرمیاہ نبی سے ہوا یسوع المسیح کی ذات اقدس میں تکمیل کو پہنچی۔ اس نے انسان کو نئی عظمت اور احساس برتری عطا کیا اور بنی آدم پر دیرپا اثرات مرتب کئے۔ خمیر کی طرح اس نے رفتہ رفتہ اپنا کام کیا۔

اس تعلیم سے دو نتائج برآمد ہوئے۔ اول، لوگوں نے آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی، کیونکہ ادنیٰ ترین غلام بھی اپنی قدرووقعت سے آگاہ ہو گیا تھا۔ دوم، روشن خیال حکمران طبقے میں سے بھی کئیوں نے محسوس کیا کہ انہیں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا کیونکہ وہ بھی انسان کی عظمت و رفعت سے باخبر ہو چکے تھے۔ پس نچلے طبقے نے آزادی کے لئے تحریکیں چلانا شروع کر دیں جن کی روحانی تمناؤں کو یسوع کی تعلیم نے جلا بخشی تھی۔ اور دوسری طرف مظلوم و مقہور عوام کی حمایت میں اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں سے بعض نے آزادی کے لئے ان تھک کوششوں کا آغاز کر دیا۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کی بدولت تمام لوگوں تک انجیل مقدس پہنچنے کے بعد مغربی دنیا کی تاریخ میں یہ دو نمایاں خصوصیات رونما ہوئیں۔

اس جدید دور میں بھی ہم ان دو رجحانات کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابرہام لنکن (۱۸۰۹ء تا ۱۸۶۵ء) دوسرے رنگ و نسل کے لوگوں کی آزادی

کے لئے لڑتا رہا اور اپنی محنت کو بارور ہوئے دیکھے بغیر شہید ہو گیا۔ اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ ایک خدا ہے جو ناانصافی اور غلامی سے نفرت کرتا ہے۔ میں چشم تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ ایک طوفان امڈ امڈ کر آرہا ہے۔ میری دانست میں اس میں خدا کا ہاتھ ہے۔ اگر اس نے میرے کرنے کے لئے کوئی کام رکھا ہے تو میں اسے کرنے کو تیار ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ اس نے میرے لئے کام رکھا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں بلکہ سچائی ہی سب کچھ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں حق پر ہوں کیونکہ آزادی حق ہے۔ المسیح کی تعلیم بھی یہی ہے اور وہ خدا ہے۔" چنانچہ اس دیہاتی بڑھئی یسوع نے دنیا کے کثیر حصے کو غلامی کی لعنت سے پاک کر دیا ہے۔ یہ شخص کون تھا جس نے تمام معاشرتی زندگی کے ڈھانچے میں انقلاب برپا کر دیا اور جس کی آمد کو لوگوں کو مجبوراً" ایک نئے دور کا آغاز ماننا پڑتا ہے۔

بہتر ہے کہ اس سوال کے جواب کے لئے ہم ان لوگوں کی تاریخ کی طرف رجوع کریں جن میں سے یہ شخص ظہور پذیر ہوا۔ ہر ملک میں عظیم ہستیاں جنم لیتی رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ انہی میں سے ایک تھے۔ اپنی قوم کی نگاہ میں انہیں نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ ان کے کارنامے تاریخی معجزے کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس صفحہ ہستی پر قومیں عروج کے بعد پھر زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یوں لوگ اپنی شناخت دوسروں میں اس طرح ضم کر دیتے ہیں کہ دنیا سے ان کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ کسی بھی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے فوراً" پتہ چل جائے گا کہ ایک قوم دوسری کو اتنی جلدی کیونکر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

پس تاریخ یہودی قوم کے وجود و بقا سے بڑھ کر کوئی اور معجزہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جب براعظم یورپ کے بہت سے حصے ابھی دریافت بھی نہیں ہوئے تھے' اس وقت بھی یہودی قوم اپنی ایک تاریخ کی مالک تھی۔ یہ قوم اپنی تاریخ کا سنہری باب دیکھ چکی تھی تو بھی یہ ایک اور عظیم الشان دور کے لئے آس لگائے بیٹھی تھی۔

بے عزتی و رسوائی' شکست کی تلخی اور اسیری کی ذلت کے باوجود اس قوم کی روح سلامت رہی۔ ہر بغاوت کا سر سختی سے کچل دیا گیا' قتل عام کا بازار گرم رہا' حتیٰ کہ رومی طاقت کی شدید مخالفت کے باوجود اہل یہود نے اپنی قوم کے فخر و تکبر پر ذرہ بھر آنچ نہ آنے دی۔ یہ قوم تمام دنیا میں تتر بتر ہو گئی۔ ان کا کوئی اپنا وطن نہ رہا۔ مسلسل ایذا رسانی' گالی گلوچ' نفرت و حقارت اور قربانی کا بکرا بن جانے کے باوجود انہوں نے اپنا وجود برقرار رکھا۔ وہ دوسری اقوام میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے طرز زندگی' زبان اور دکھ سکھ میں شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے ان قوموں کے تحفظ کی خاطر جن کے درمیان وہ سکونت پذیر تھے اپنے گراں قدر جوانوں کی قربانیاں پیش کر دیں۔ انہوں نے غیر اقوام کو صنعت و تجارت' علم و ہنر اور انتظامی امور کے شعبوں میں لائق قیادت مہیا کی' جس نے جداگانہ نسل و مذہب کے لوگوں کے ساتھ دل کھول کر کام کیا اور اس کے باوجود اپنی قومی شناخت برقرار رکھی۔ تاریخ عالم اس سے بڑا کوئی اور معجزہ نہیں دکھا سکتی۔ یہودی قوم سب کچھ کھو بیٹھی سوائے اپنے خدا کے۔ جب وہ اپنے وطن اور آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھے اس وقت بھی ان کا

یہوواہ (خدا تعالیٰ) پر ایمان زندہ تھا اور وہ نہ بھولے کہ وہ یہوواہ کی خاص الخاص قوم ہیں۔ جب ہزاروں سال پیچھے نگاہ دوڑائیں تو ہمیں حضرت موسیٰ جو یہودی تاریخ کی تمام عظیم شخصیات سے افضل ہیں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بڑے صبر و استقلال سے بکھرے ہوئے غلاموں کو ایک متحد قوم کی شکل عطا کی۔ انہوں نے انہیں اتحاد و اتفاق کی برکات سے روشناس کرایا جسے نہ گردش وقت برباد کر سکی اور نہ مخالفت زمانہ' کیونکہ ان کی شناخت کا دارومدار ان کے اس تعلق پر ہے جو وہ قیوم ولا تبدیل خدا کے ساتھ رکھتے ہیں۔

فی الحقیقت حضرت موسیٰ اس بات کے حقدار ہیں کہ انہیں "عظیم" کہا جائے۔ اگر ایسا راہبر کسی اور قوم میں جنم لیتا تو اسے معبود بنا لیا جاتا۔ مگر ایسا خیال کبھی کسی یہودی کے قریب سے بھی نہ گزرا کیونکہ اس کے نزدیک اس قسم کا محض تصور ہی کفر تھا۔

ہاں! دیہاتی بڑھئی یسوع کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کا نام اس کے عقیدت مند ساتھیوں کی بدولت چند سال تک گاؤں اور قصبے کی گلیوں میں گونجتا رہا اور پھر ----- اسے رسوا کن اور شرمناک موت کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ایک غیر معمولی بات واقع ہوتی ہے۔ وہی راسخ الاعتقاد اور توحید پرست یہودی جو اپنے خدا کی تعظیم کے سلسلے میں بڑے غیور تھے بدل گئے اور اسی یسوع کی پرستش کرنے لگے اور اسے "خداوند" کا وہ لقب دیا جو فقط یہوواہ (خدا) کے لئے ہی مخصوص تھا۔

اگر وہ یونانی یا رومی (بت پرست) ہوتے تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہ

ہوتی، مگر وہ تو موحد یہودی تھے! ان کے ہاں حضرت موسیٰ کو "خداوند" کہنا کفر تھا اگرچہ ان کے نزدیک ان کا بڑا مقام و مرتبہ تھا۔ یہ یسوع کون تھا جس نے ایک مجرم کی موت مرتے ہوئے اس صاحب اقتدار طبقے کے دل بھی اپنی پرستش کے لئے جیت لئے جنہوں نے اسے رسوا کن صلیب پر کیلوں سے جڑ دیا تھا؟ اس کی اپنی قوم نے اسے رد کر دیا، اوروں نے اسے قابل احترام نبی مانا جبکہ اپنے پیروکاروں کے نزدیک وہ خدائے مجسم ہے۔ لہٰذا انسانی تاریخ میں یسوع ناصری کو لاثانی مقام حاصل ہے۔ ہم کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں اس کی شخصیت کو نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔ اس کی آمد سے تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے اور اس کی ذات اقدس ہی اس دور کی توضیح کرتی ہے۔

باب دوم

یسوع المسیح کون تھا؟

کیا تحریری شہادتیں قابل اعتبار ہیں؟

اس باب میں ہم تحریری ریکارڈ کی صحت و وقعت پر مختصراً سوچ بچار کریں گے جو یسوع المسیح کے متعلق معلومات مہیا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور پھر ہم اس کی شخصیت کے متعلق بعض ایسے نظریات پر غور کریں گے جنہیں تاریخی حقائق اور مسیحی تجربہ باطل ثابت کرتا ہے۔

عام خیال ہے کہ مسیحیت کی بنیاد ایک "کتاب" ہے، حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ مسیحی کلیسیا کی ابتدا انجیلوں کی مرہون منت نہیں ہے۔ اناجیل اربعہ اور دیگر صحائف جن پر نیا عہدنامہ مشتمل ہے، مسیحی کلیسیا کو معرض وجود میں لانے کا باعث نہیں بنے بلکہ اس کے برعکس ان کا وجود کلیسیا کا مرہون منت ہے۔ تاہم نئے عہدنامے نے نہ صرف یسوع کی تعلیم اور حالات زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے بلکہ ابتدائی کلیسیا کے تجربات اور عقائد بھی اپنے دامن میں سمیٹ رکھے ہیں۔ لہٰذا تحقیق و مطالعے کی خاطر ہمارے ہاں اس کی بے حد قدروقیمت ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر اتنی تنقید کی گئی ہو، اتنا تجزیہ کیا گیا ہو یا اتنی باریک بینی سے پرکھا گیا ہو جتنا کہ نیا عہدنامہ۔ بدیں وجہ ہم بہت اعتماد

کے ساتھ اس کی طرف توجہ مبذول کر سکتے ہیں۔ ایسے تمام حالات میں اس کا قائم و دائم رہنا اس بات کا جواز پیش کرتا ہے کہ ہم تاریخ اور تجربے کی حقیقت و صداقت کے متعلق اس کی دیانتداری پر بھروسا کریں۔

آیئے عہدنامہ جدید (انجیل مقدس) کی بعض کتابوں پر سرسری نگاہ ڈالیں۔ سب سے پہلے پولس رسول کے خطوط کی باری آتی ہے جو ہمیں یسوع کی صلیبی موت کے زمانے کے قریب لے جاتے ہیں۔ پہلا خط قریباً ۴۸ء کے اخیر میں لکھا گیا جب ایشیائے کوچک میں کلیسیائیں قائم ہو چکی تھیں اور یونانیوں اور دیگر غیریہودی لوگوں کی کثیر تعداد مسیحیت کی طرف رجوع کر رہی تھی۔ علاوہ ازیں یہ خطوط مغرب حتیٰ کہ روم اور اس سے پرے سپین میں پھیلنے والی مسیحیت کی تاریخ پر ایک دلچسپ تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط کے سلسلے کا آخری خط روم سے ۶۲ - ۶۱ء میں کلیسیاؤں کے نام لکھا گیا جب کلیسیا رومی سلطنت کے دارالحکومت میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی۔

جہاں تک اناجیل اربعہ کا تعلق ہے انجیل مرقس پہلی تحریر ہے جو قریباً ۶۵ء میں لکھی گئی جب مقدس مرقس روم میں تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پیشتر اس کے کہ کوئی انجیل منظرعام پر آئی پولس رسول کے تمام خطوط قلم بند ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ پہلے کی نسبت اب اسے زیادہ اہمیت دی جائے' کیونکہ یہ انجیلی بیانات کی تاریخی قدروقیمت کی انمول شہادت فراہم کرتی ہے۔ آیئے اب اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں۔ مقدس مرقس نے روم میں بیٹھ کر اپنی انجیل لکھی جب وہاں کلیسیا بہت مضبوط ہو چکی تھی

اور مقدس پطرس اور مقدس پولس بھی وہیں مقیم تھے۔ مقدس پولس کے خطوط کلیسیا کو ہمارے سامنے زندہ عمارت کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور ہمیں دکھاتے ہیں کہ کس طرح اس کی زندگی المسیح کے بڑھتے ہوئے تجربے کے باعث تشکیل پا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اس میں خدا کا ظہور دیکھ کر پرستش کی حد تک اس کا احترام کیا۔ یہ خطوط ہمیں اس پس منظر سے آگاہ کرتے ہیں جس میں یہ اناجیل قلم بند ہوئیں۔ کلام الٰہی کے طالب علم کے لئے بہتر ہو گا کہ پہلے وہ افسیوں کے نام کے خط کا مطالعہ کرے جو پولس نے روم میں لکھا اور پھر مقدس مرقس کی معرفت لکھی گئی انجیل پڑھے جو چند سال بعد اسی شہر میں ضبط تحریر میں لائی گئی۔ اس میں یسوع کی زندگی کے اہم واقعات کا اجمالی تذکرہ ملتا ہے جس کے لئے ایک چشم دید گواہ پطرس کی زبانی یادداشتوں کو بنیاد بنایا گیا ہے جو بعد میں اسی ایمان کی خاطر مصلوب ہوا۔

گو مصنف یسوع کو خداوند جان کر اس کی عبادت کرتا تھا تو بھی وہ کہیں بھی یسوع کی زبانی اس کی الوہیت کا واضح اور دو ٹوک اظہار نہیں کرتا۔ وہ کبھی کسی بات پر اس خیال سے حاشیہ چڑھانے کی کوشش نہیں کرتا کہ کلیسیا کے مخالفین کو تنقید و نکتہ چینی کا موقع نہ ملے اور نہ وہ بعض رسولوں کی نازیبا حرکات پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہی کرتا ہے۔ ان کی کمزوری اور غلطیاں اور اس یسوع سے جس کی وہ اب پرستش کر رہے تھے ان کی بزدلانہ کنارہ کشی کھول کر بیان کرتا ہے۔ شاید ہی کوئی تاریخ نگار ہو جو مرقس کی طرح حقیقت و صداقت کا دامن تھام کر مکمل غیرجانبداری سے تاریخی واقعات سپرد قلم کرنے میں

کامیاب ہوا ہو۔ کہانی ہر قاری کے دل پر گہرا اثر کرتی ہے کیونکہ مصنف نے کہیں بھی مبالغہ آرائی یا حقیقت سے پہلو تہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ہم یہاں عہدنامہ جدید کی تحریروں کے تنقیدی مطالعے کے عام طریقوں اور ان کے نتائج پر بحث تو نہیں کر سکتے البتہ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ ان طریقوں کی معرفت عہدنامہ جدید کے مختلف حصوں کی تاریخوں کی تحقیق سے ان کی تاریخی قدروقیمت اور صحت و صداقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ پس ہم کامل یقین کے ساتھ اپنے مطالعہ و تحقیق پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ مرقس کی انجیل کی مانند متی اور لوقا کی انجیل پر بھی انہی باتوں کا اطلاق ہوتا ہے جبکہ یوحنا کی انجیل میں ہمیں ایک ایسے عمر رسیدہ شخص کے پختہ غوروفکر کا بیش بہا ریکارڈ ملتا ہے جو یسوع کے بارہ شاگردوں میں سے تھا۔

یسوع المسیح کے متعلق مختلف نظریات

پیشتر اس کے کہ ہم اپنے مطالعے کا آغاز کریں بہتر ہو گا کہ یسوع المسیح کی شخصیت کے متعلق قائم شدہ چند نظریات پر سرسری نگاہ ڈالیں جن کی تردید کے لئے ہمیں مسیحی تجربہ مجبور کرتا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مثبت فیصلے کی نسبت منفی فیصلہ تشکیل دینا نسبتاً آسان ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں مثبت علم تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس طریقے کا انتخاب مفید و کارآمد ہے۔ یسوع کے بارہ شاگردوں میں سے ایک نے اسے کہا "اے میرے خداوند! اے میرے خدا!" اس بیان میں

ہمیں مسیحی کلیسیا کے بنیادی رویے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس ایمان کا آغاز عقیدے سے نہیں بلکہ تجربے کی بنا پر ہوا۔ الفاظ کے سانچے میں ڈھلنے سے پہلے پرستش کی صورت میں اس کا اظہار ہوا۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کسی پر ٹھونسے جانے والے زبانی عقیدے اور آزمودہ سچائی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یسوع کے متعلق یہ جداگانہ رویہ جو ایک مسیحی کا شناختی نشان ہے بہتوں کے لئے ناقابل فہم ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان یسوع کو پیغمبر سمجھتا ہے مگر مذکورہ مسیحی عقیدے کو شرک کا نام دیتا ہے۔ پھر کچھ گاندھی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۸ء) جیسے لوگ بھی ہیں جو یسوع کو ایک مذہبی سورما' روحانی زندگی کا ہیرو اور انسانیت کے اعلیٰ ترین نمونے کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں مگر ان کے نزدیک بھی ایسا عقیدہ قابل قبول نہیں۔ بعض اسے ایک عظیم بلکہ عظیم ترین استاد کہتے ہیں جس جیسا زمانے کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا لیکن اس سے بڑھ کر وہ کچھ نہیں جانتے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اسے فریبی غیب بین یا ایسا آدمی تصور کرتے ہیں جو اپنے مذہبی جنون کی نذر ہو گیا۔ تاہم اس کے متعلق مسیحی ایمان پر یہ اعتراض بھی اس کی عظمت میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسیحی ضمیر نے یہ تمام نظریات کیوں رد کئے اور اس بات پر اڑا رہا کہ یسوع الٰہی ذات ہے؟

(حاشیہ) یہی عقیدہ اثناسیس کے قدیم عقیدے میں یوں بیان ہوا: "یسوع . . . خدا بھی ہے اور انسان بھی . . . اس طور پر نہیں کہ الوہیت کو جسمانیت سے بدل ڈالا بلکہ اس طور پر کہ انسانیت کو الوہیت میں لے لیا۔"

کیا یسوع ایک نبی تھا؟

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ لفظ "نبی" سے کیا مراد ہے؟ ایک نبی کا امتیازی نشان کیا ہوتا ہے؟ انجیل مقدس میں مرقوم ہے کہ "نبوت کی کوئی بات آدمی کی خواہش سے کبھی نہیں ہوئی بلکہ آدمی روح القدس کی تحریک کے سبب سے خدا کی طرف سے بولتے تھے" (۲- پطرس ۱ : ۲۱)۔ ہم ایک نبی سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ کہے "خداوند فرماتا ہے" نہ کہ "میں تمہیں کہتا ہوں۔" ہم بعد کے ایک باب میں یسوع کے پراختیار فرمودات پر غور کریں گے۔ یہاں صرف اس بات کی نشاندہی کر دینا ہی ضروری ہے کہ نبی کی اس آگاہی میں کہ خدا کی طرف سے اس کے سپرد ایک پیغام ہوا جسے عوام تک پہنچانے پر مجبور ہوتا ہے ("خداوند خدا نے فرمایا ہے کون نبوت نہ کرے گا؟" عاموس ۳ : ۸) اور کسی شخص کے صاحب اختیار ہونے کی آگاہی میں ("میں تم سے یہ کہتا ہوں" متی ۵ : ۲۲) زمین آسمان کا فرق ہے۔

علاوہ ازیں تمام انبیائے کرام نئے نئے مذاہب کے بانی نہیں تھے۔ ان کی اکثریت مصلحین کی تھی مثلاً حضرت یسعیاہ اور حضرت عاموس، جن کے پاس معاشرتی بدعنوانی کا بوجھ تھا جس سے مذہب کو پاک کرنا تھا۔ اگر ان کی تعلیمات تحریری صورت میں ہم تک نہ پہنچتیں تو ہمیں ان کے متعلق بہت کم علم ہوتا۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ ایک عظیم مذہب کے بانی تھے۔ ان کے انتقال کے وقت انہیں یہودی قوم کے مقبول و مسلم رہنما اور استاد کی حیثیت حاصل تھی۔

اہل یہود کے نزدیک وہ ایک عظیم صاحب شریعت اور ایک ایسا شخص ہیں جس کی تعلیمات کی بنیاد پر قومی زندگی کی عمارت استوار ہے۔ ایک ایسی عمارت جسے نیست و نابود کرنے میں مخالف حالات کے طوفانی جھکڑ بھی ناکام رہے۔ لیکن مصلوبیت کے وقت یسوع کے شاگرد اسے تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دنیا کی نگاہ میں یہ ایک ناکامی تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنے پیچھے کوئی کام نہ چھوڑا۔ وہ صلیب پر ایک مجرم کی موت مرا' اس نے نہ شریعت دی اور نہ کسی قسم کی تحریر ہی چھوڑی۔ اس کی صلیبی موت کے چند ہی گھنٹے بعد اہل یروشلیم اسے بھول کر عید فسح کی تقریبات میں کھو گئے۔ اگر یسوع المسیح رد کیا ہوا کوئی نبی ہوتا تو دنیا اس کی آواز پر کان نہ دھرتی۔ اس کے پیروکار یہ سمجھنے لگے تھے کہ انہوں نے دھوکا کھایا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ان واقعات کا اپنی زندگی میں ذکر کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اس قدر وہم کا شکار تھے کہ جب انہوں نے قیامت المسیح کا سنا تو اس خبر کو ایک "فرضی کہانی" تصور کرنے لگے (لوقا ۲۴ : ۱۱)۔ اگر یسوع ایک رد کیا ہوا نبی ہوتا تو تاریخ ایک اور رخ اختیار کرتی بلکہ اسے بالکل فراموش کیا جا چکا ہوتا!

کیا یسوع ایک مذہبی سورما تھا؟

کیا یسوع ایک مذہبی سورمے اور روحانی زندگی کے ہیرو سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا؟ مذکورہ بالا دلائل کا اطلاق یہاں پر بھی ہوتا ہے۔ اگر یسوع اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تو کلیسیا معرض وجود میں نہ آتی اور نہ انجیل مقدس ہی لکھی

جاتی۔ لیکن آیئے اس سوال پر دوسرے زاویے سے غور کریں۔ ہیرو اور سورمے کی شخصیت کیا مقام رکھتی ہے؟ یہاں اس سوال کا جواب ہماری مدد کرے گا۔ ہیرو اور سورما کی اصطلاحات کا اطلاق لاتعداد اشخاص پر ہوتا ہے جو تاریخ کے سٹیج کو عبور کر چکے ہیں اور بعض تو روئے زمین پر آج بھی زندہ ہیں' لیکن یسوع منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اس کا اپنا ہی ایک مقام ہے۔ مذہبی سورمے یا ہیرو کی دوسرے انسانوں پر برتری ایک قابل پیائش مقدار ہوتی ہے' یہ معاملہ اس وقت صاف ہو جاتا ہے جب ہم کسی عظیم شخص کے حالات زندگی کا اثر اپنے آپ پر محسوس کرتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ تعلیم کا ایک لازمی جزو ہے اور ہم بہت سی نامور شخصیات کی سرگذشت حیات سے بخوبی واقف ہیں۔ آیئے ایک ذہین و فطین سائنس دان آئن سٹائن کی زندگی پر غور کریں۔ جب ہم اس کی زندگی کا مطالعہ کرتے اور اس کے کارہائے نمایاں پر غور کرتے ہیں تو ہماری سوچ پر اس کی ذہانت و قابلیت کی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم اپنے آپ کو معمولی و بے حقیقت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ ہمیں حقیقی احساس کمتری میں مبتلا کر کے خیالات کی بلندیوں کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ ہم اپنے اور اس کے مابین بڑی دوری محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں اسے سراہنا پڑتا ہے مگر ـــــ مردہ دلی سے' کیونکہ وہ ہم سے مختلف سطح پر دکھائی دیتا ہے۔

انجیل مقدس میں مذکور یوحنا اصطباغی (حضرت یحییٰ) کا سرسری مطالعہ کریں۔ یہاں آپ کے سامنے ایک مختلف طرز کا شخص آتا ہے جو مذہبی سورمے اور ہیرو سے کم نہیں۔ اب آپ اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ

اس کی سادگی اور حق و صداقت کے ضمن میں حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے کے وصف پر حیران رہ جائیں گے۔ لیکن خراج تحسین بھی سرد مہری کا شکار ہے کیونکہ آپ کے اور اس کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے جسے عبور کرنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔

البتہ جب آپ انجیل جلیل میں یسوع کے بارے میں پڑھتے ہیں تو آپ میں بہت مختلف سوچ جنم لیتی ہے۔ آپ میں فوراً یہ احساس بیدار ہو گا کہ وہ آپ سے بے انتہا عظیم ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے اپنے قریب محسوس کرتے ہیں۔ اس کی ذات اور قدرت آپ کو آپ کی کمزوری اور کم مائیگی کے باوجود اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنے میں آپ کی ہمت بڑھاتی ہے۔ اس کی پاکیزگی سے آپ پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی عظمت سے ہمیں مرعوب نہیں کرتا بلکہ ہماری آنکھیں خدا کی محبت کے لئے کھول دیتا ہے اور ہم اس میں خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ یسوع ایک ہیرو یا مذہبی سورمے سے بڑھ کر ہے!

کیا یسوع محض ایک عظیم استاد تھا؟

اس سوال کا جواب بھی ہم ایک اور سوال کے کرنے پر ہی دے سکتے ہیں۔ استاد کا کام کیا ہوتا ہے؟ یا بالفاظ دیگر تعلیم کا کیا مقصد ہے؟ شاید تعلیم کا مقصد تمام انسانی صلاحیتوں کو جلا دینا ہے تاکہ وہ معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے تمام معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے قابل ہو جائے۔ استاد

کا کام ترقی کی شاہراہوں پر گامزن ہونے کے لئے فرد کی مدد و راہنمائی کرنا ہے۔ پھر طالب علم کی زندگی میں ایسا وقت بھی آنا چاہیے جب اسے استاد کی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ استاد کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے طالب علموں کو اس نوبت تک پہنچائے جہاں انہیں استاد کی ضرورت نہیں رہتی۔

وہ استاد جو اپنی ذات کو اپنے شاگردوں کے لئے ناگزیر بنا لیتا ہے اور انہیں سکھاتا ہے کہ اپنی ہر ضرورت اور تمام معاملات میں فقط اسی پر اعتماد کریں، اچھا استاد نہیں سمجھا جاتا۔ اگر یسوع بھی محض ایک معلم ہی ہوتا تو اس کا مقام دوسرے اساتذہ سے بدتر ہوتا کیونکہ اس نے ایسا ہی طرزِعمل اختیار کیا۔ اس نے اپنے شاگردوں کی اہلیت سے بڑھ کر کچھ کرنے کی ترغیب تو دی لیکن ساتھ ہی دیدہ و دانستہ اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اس پر اعتماد کریں اور کہ وہ اس کے بغیر کچھ بھی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جب وہ مصلوب ہوا تو ان کی آسوں کا محل دھڑام سے گر پڑا۔ وہ تمام ذمہ داریاں جو انہیں سونپی گئی تھیں یکسر بھول گئے۔ وہ تمام ذمہ داریوں کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور جب تک انہیں اس بات کا یقین نہ ہو گیا کہ وہ دوبارہ جی اٹھا ہے مایوسی اور خوف کے عالم میں مارے مارے پھرتے رہے۔ وہی ان کی آرزوؤں کا مرکز تھا جس نے مر کر ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ ان سے جدا کیا جائے گا اور وہ اسے تنہا چھوڑ کر فرار ہو جائیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے اپنے مشن کا کوئی احساس نہیں تھا؟ کیا

اس کی تعلیم و تربیت اس مقصد کے حصول میں مکمل طور پر ناکام ہو گئی؟ اگر ایسا ہی ہوتا تو کیا وہ اساتذہ کی صف میں سب سے زیادہ نادان نہ ٹھہرتا؟ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ان سے جدا کیا جائے گا اس نے انہیں کیوں نہ سکھایا کہ وہ اس پر انحصار نہ کریں تاکہ اس سے بچھڑ کر بھی وہ اپنا کام جاری رکھنے کے قابل ہوں؟ محض ایک استاد اور وہ بھی نالائق استاد تاریخ کا دھارا نہ بدل سکتا۔

کیا یسوع ایک فریب خوردہ غیب بین تھا؟

ہم ایک ایسے آدمی کا تصور کر سکتے ہیں جو اپنے داؤ پیچ کی بدولت ایک بڑے ہجوم کے ذہنوں پر وقتی طور پر اثرانداز ہوتا ہے۔ مگر اس کے اختتام پر کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ اگر یسوع ایک فریب خوردہ غیب بین ہوتا تو موت کے وقت اس کا کوئی نہ کوئی غم خوار تو ضرور ہوتا مگر اس کی پیروی کوئی نہ کرتا۔

کلیسیا اور انجیل مقدس کا وجود، تمام مغربی دنیا میں اتوار کے دن کی چھٹی اور سن عیسوی ایسی حقیقتیں ہیں جو کہ مندرجہ بالا تمام نظریات کی تردید کرتی ہیں۔ لہٰذا وہ سب نظریات حقائق کی کسوٹی پر دم توڑ جاتے ہیں۔ اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام قیامت المسیح کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یسوع المسیح کے متعلق ہر وہ نظریہ جو اس کے مردوں میں سے جی اٹھنے کا ذکر نہیں کرتا آخرکار ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب وہی سوال پوری آب و تاب کے ساتھ ایک بار پھر سامنے آتا ہے کہ "المسیح کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے؟"

باب سوم

ہماری مانند

زیر نظر کتاب کے مصنف کا مقصد اپنے قارئین کو انجیل مقدس کا متبادل مہیا کرنا ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس کتاب کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ قاری انجیلی بیانات کا مطالعہ کر چکا ہے۔ اس کتاب میں نہ المسیح کے حالات زندگی بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی اور نہ اس کی تعلیمات ہی بیان کی جائیں گی، کیونکہ ہمارا مطلب فقط یسوع المسیح کی شخصیت سے متعلق اس مسیحی تجربے سے ہے جس کی اظہار اس کی پرستش میں ہوتا ہے۔

یسوع کے ابتدائی پرستار وہ لوگ تھے جو اس کی زمینی زندگی کے دوران اس کے بہت قریبی پیروکار اور دوست تھے۔ انجیل نویس ایک ایسی ہستی کی تصویر پیش کرتے ہیں جو کہ انسانوں کی صف میں کھڑی تھی ----- انسانوں میں سے ایک۔ جیسے کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، یہاں پر حاشیہ آرائی سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔ اسی وجہ سے یہ بیان قاری کو اتنا زیادہ متاثر کرتا ہے۔

ایک چیز جو ہمیں بہت متاثر کرتی ہے وہ یسوع کی استقامت و ثابت قدمی ہے۔ اس کے سامنے ایک واضح مقصد ہے اور مخالف حالات کے باوجود وہ اس کی جانب رواں دواں ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اپنا طریقہ کار بدل لیتا ہے مگر

اس کا عزم جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ اس کی مضبوط قوت ارادی ہمیں بہت متاثر کرتی ہے۔ اپنے مقصد کے لئے اس کی شدید الفت و لگن ہماری حمد و توصیف حاصل کر لیتی اور ہم میں اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے جذبے پیدا کرتی ہے۔ وہ بڑے زور سے ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جب ہم قریب ہو کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہماری ہی طرح کا ایک حقیقی انسان ہے اور پھر اس کے برعکس اس کی ذات کا دوسرا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے جسے ہم "اجنبیت" کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ ہم سے یکسر مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس کا "ہمارے جیسا" ہونا ہمیں اس کی طرف کھینچتا ہے جبکہ اس کا ہم سے "جداگانہ ہونا" اس کی اس دلکشی کو اور مضبوط کرتا ہے کیونکہ یہ ہماری شدید ضروریات کی تشفی کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر ہم تعصب کی عینک اتار کر انجیل مقدس کا مطالعہ کریں تو ہمیں یسوع کی ذات میں حیرت انگیز تسلی و اطمینان ملتا ہے اور ہم اس کی تعلیم کی نسبت اس کی شخصیت پر زیادہ غور و خوض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خود اپنی تعلیمات کا مجسمہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہم پر اثرانداز ہو رہا ہے۔ اگر ہم انجیل جلیل کو اس نقطہ نظر سے دوبارہ پڑھیں کہ یسوع کہاں کہاں ہماری مانند ہے اور وہ کونسی باتیں ہیں جو اسے ہم سے جداگانہ ہستی پیش کرتی ہیں تو شاید ہم اس اثر کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

اس باب میں ہم اس کا ہماری طرح کے انسان کے طور پر مطالعہ کریں

گے۔ اس چھوٹے سے باب میں یسوع المسیح کی بشریت کے متعلق تمام انجیلی بیانات کو مکمل طور پر بیان کرنا ناممکن بات ہے۔ ہم اس کے بارے میں فقط چند ایک مگر اہم حقائق کا ذکر کریں گے جو اس بات پر کھل کر روشنی ڈالتے ہیں کہ وہ کن معنوں میں حقیقی انسان تھا۔

انسان ایک سوشل ہستی واقع ہوا ہے۔ بچپن کا طویل عرصہ خاندانی تعلقات کو نہایت مضبوط بناتا ہے اور یوں شخصی محبت کو پروان چڑھاتا ہے۔ لوگ عظیم شخصیات کی خاندانی زندگی پر لکھی گئی کتب میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہیں؟ اس لئے کہ کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو ان کے مابین مشترک ہے اور جس کی وہ قدر کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے جنگلوں میں رہنے والا یوحنا اصطباغی (حضرت یحییٰ) ہمیں مرغوب تو کر لے مگر اس انداز میں ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا جیسے یسوع ایک بچے کو اپنی گود میں بٹھا لینے پر کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ یوحنا کی طرح گھریلو خوشیوں سے دستبردار تو ہو گیا مگر اس نے ان کی تحقیر نہ کی۔ وہ ہمیشہ انسانی خوشیوں میں شریک ہوتا رہا۔ یہاں اس کی بشریت بہت واضح ہے۔ ہم یوحنا اصطباغی کے بارے میں ایسا محسوس نہیں کرتے جیسا کہ یسوع کے متعلق کیونکہ اس کی اپنے گھر اور رشتے داروں سے لاتعلقی ایک عظیم قربانی کا نتیجہ تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ بیت عنیاہ میں مریم، مرتھا اور لعزر کے گھر جانے سے یسوع کس قدر خوش ہوتا تھا اور ان کے ساتھ اس کے کتنے اچھے تعلقات تھے۔ مقدس یوحنا بیان کرتا ہے کہ مریم کو اپنے بھائی کی موت پر آہ و زاری کرتے ہوئے دیکھ کر یسوع کا دل بھر آیا اور مریم کے ساتھ اس کے بھی آنسو

بننے لگے (یوحنا ۱۱ : ۳۳ - ۳۵)۔

یسوع سمجھ گیا تھا کہ مریم کتنی رنجیدہ ہے کیونکہ بیت عنیاہ کے اس گھر کی ہر خوشی میں وہ شامل ہوتا رہا تھا۔ "لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں" (لوقا ۹ : ۵۸)۔ وہ چٹانوں کے درمیان ایک چھوٹی غار کے پاس لومڑی کے بچوں کو کھیلتے اور ان کی ماں کو بہت ناز سے ان کی نگرانی کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ غروب آفتاب کے وقت اپنے گھونسلوں کو لوٹتے ہوئے کوؤں کی خوشگوار کائیں کائیں کی آواز جب اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے تو شاید وہ تنہائی محسوس کرتے ہوئے ایک گھر کی تمنا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔ یسوع کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے دوست ہوں جن کی رفاقت میں وہ رہے۔ پھر اس نے بارہ کو چنا تاکہ اس کے ساتھ ساتھ رہیں۔ ان کے ساتھ اس کی دوستی کا بندھن اس کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے جو وہ ان سے روا رکھتا تھا۔ اس کے دوستی کے اظہار کے انداز وہی تھے جنہیں ہم اپنے دوستوں کے لئے اپناتے ہیں۔ وہ ان کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھا۔ وہ انہیں بہت چاہتا تھا اور پیار سے ان کے نئے نام تجویز کرتا تھا (مرقس ۳ : ۱۳ - ۱۹)۔ محبت کی وسعت کا مطلب ہے دکھ کے لئے گنجائش اور یسوع ان دونوں صلاحیتوں سے مالامال تھا۔ ان سے جدائی کے وقت اس کا دکھ بڑا بھاری تھا (لوقا ۲۲ : ۱۵) اور اس کی بڑی آرزو ہوتی تھی کہ تنہائی میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزارے۔ وہ ان کی ہمدردی اور رفاقت کا متمنی تھا۔ اس کی بڑی تمنا تھی

کہ وہ اس کے مقاصد کو سمجھیں مگر وہ اس سلسلے میں کند ذہن ہی واقع ہوئے۔ وہ آرام سے پڑے سوتے رہے جبکہ وہ آپ شدید روحانی کرب سے دوچار تھا۔ اس نے پطرس سے مخاطب ہو کر کہا "اے شمعون...! کیا تو ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکا؟" (مرقس ۱۴ : ۳۸)۔ اس وقت اسے انسانی رفاقت اور ایک ہمدرد و غم خوار دوست کی بہت ضرورت تھی۔ بعدازاں اسی رات یہوداہ اسکریوتی نے اس کے دل کو کتنا دکھ پہنچایا! یسوع نے اس سے کہا "اے یہوداہ! کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے؟" (لوقا ۲۲ : ۴۸)۔ یوں اس نے دوستی کے اس مقدس رشتے سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

یسوع کس قدر ہماری مانند تھا ؟ وہ کوئی ستوئیکی نہ تھا جو تمام طرح کے جذبات کو دبانا خدا ترسی کا راستہ سمجھتے تھے۔ وہ ناانصافی اور آدمیوں کی بیماریوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ دوستی کے ناتے سے روزمرہ زندگی کے تمام معاملات میں اس نے محبت اور دکھ کے لئے بڑی وسعت ظاہر کی۔ ننھے منے بچے اس کی طرف دوڑے چلے آتے تھے اور پھر وہ ان پر اپنی شفقت لٹائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ عصمت فروشی کا دھندا کرنے والی عورتیں جب مایوسی کے عالم میں رحم و کرم کے لئے یسوع کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو تقویٰ فروش جو دوسروں کی عیب جوئی کرنے میں بڑے تیز تھے اس کے ساتھ خفا ہونے لگے۔ وہ جو اسے بہت قریب سے جانتے تھے یہ نہیں بھولے تھے کہ جب لوگوں نے مذہب کو اپنے دلوں کی سختی اور کجی کی اوٹ بنا لیا تو کیسے اس کی آنکھوں سے غصے کے شعلے بھڑکنے لگتے تھے (مرقس ۳ : ۵)۔ ابھی وہ واقعہ ان

کے ذہن سے نہیں اترا تھا کہ کیسے تاجروں اور صرافوں نے خدا کے گھر کو ایک بازار بنا رکھا تھا اور مذہب کو پیسہ بٹورنے کا وسیلہ بنایا ہوا تھا۔ خدا کے گھر کی غیرت اسے کھا گئی اور طیش میں آکر اس نے ہیکل کی بحالی کے لئے اپنے زور بازو کا استعمال کیا (مرقس ۱۱ : ۱۵ - ۱۸' یوحنا ۲ : ۱۳ - ۲۰)۔ اس کے غضب میں ایک نہایت خوفناک عنصر شامل تھا جس نے انہیں مرعوب ہو کر کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا' لیکن اسی بات کے باعث ہم اس سے اور بھی محبت و عقیدت رکھتے ہیں کیونکہ اسی سے اس کی حقیقی بشریت ظاہر ہوتی ہے۔

عہدنامہ جدید کا بے لاگ مطالعہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ انجیل نویسوں نے یسوع کے بچپن کے معجزات کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اس کے برعکس ایک مصنف نے قصداً" اس معجزے کو جو اس نے قانائے گلیل میں اپنے مشن کے آغاز میں دکھایا "پہلا معجزہ" کہا ہے (یوحنا ۲ : ۱۱)۔ اگلے صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ اس کا پہلا معجزہ اس سے اتنے ہی مضبوط ایمان کا تقاضا کرتا تھا جتنا کہ وہ خود اپنے پیروکاروں سے چاہتا تھا' جن کی خاطر اس کے عظیم کام ظاہر ہوتے تھے۔

یہ حقیقت اس کی آزمائش کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ اس پر پہلی آزمائش اس وقت آئی جب وہ اپنے مشن سے مکمل طور پر آگاہ ہو چکا تھا۔ آزمائش یہ تھی کہ وہ اپنی بلاہٹ اور منصب کی صداقت کے ثبوت میں معجزہ دکھائے۔ ایسی آزمائشوں کے موقعوں پر یسوع نے کبھی کوئی معجزہ نہ کیا (متی ۴ : ۳)۔ انجیل مقدس میں یسوع کے بچپن کی صرف ایک ہی جھلک ملتی ہے جس کی معرفت

ہمارے سامنے ایک ایسا بچہ آتا ہے جو عام بچوں کی طرح مشاہدہ کرنے، سوالات پوچھنے اور نئی نئی دریافت کرنے میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے (لوقا ۲ : ۴۱ - ۵۲)۔ البتہ مذہب میں اس کی گہری دلچسپی ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ اس وقت صرف بارہ برس کا تھا۔ اس کی وہ دلچسپی محض تجسس اور اشتیاق ہی نہیں تھا۔ یسوع کی بعد کی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ معلومات حاصل کرنے کے لئے وہ سوال پوچھنے کا بالکل عام طریقہ استعمال کرتا تھا۔ وہ بدروح سے دریافت کرتا ہے کہ تیرا نام کیا ہے (مرقس ۴ : ۹)۔ وہ بڑی بھیڑ میں اپنے شاگردوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ جاننے کا مشتاق ہے کہ کس نے دیدہ و دانستہ اسے چھوا ہے (مرقس ۵ : ۳۰)۔ وہ شفائیہ معجزات کے دوران بھی سوالات کرتا ہے۔ وہ اندھے سے پوچھتا ہے "کیا تو کچھ دیکھتا ہے؟" اس کے جواب پر وہ دوبارہ اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتا ہے (مرقس ۸ : ۲۳ - ۲۵)۔ جب مرگی والے لڑکے کو اس کے پاس لایا جاتا ہے تو وہ غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ یسوع اس کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کرتا ہے کہ لڑکے کو کتنے عرصے سے یہ مرض لاحق ہے (مرقس ۹ : ۲۱)۔ وہ جانتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس کی تعلیم کتنی انقلابی لگتی اور اس کے دعوے ان کے لئے کس قدر ٹھوکر کا باعث ہیں۔ اس کا صحیح اندازہ ہے کہ اس کی باتوں کا مختلف طبقوں کے لوگوں پر کیا اثر ہوتا ہے (مرقس ۲ : ۶ - ۸، ۳ : ۲ - ۴)۔

جب اس کے شاگرد اس کے سوال کا جواب دینے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ ان کے خیالوں کو بھانپ جاتا ہے (مرقس ۹ : ۳۳ - ۳۷)۔ وہ اچانک اس

بھیڑ میں آ داخل ہوتا ہے جو شاگردوں کے گرد جمع تھی اور ان سے بحث کر رہی تھی۔ اس نے پہلا سوال یہ کیا "تم ان سے کیا بحث کرتے ہو؟" اگر ہجوم پر نگاہ ڈالنے سے پیشتر وہ بیمار لڑکے کو دیکھ چکا ہوتا تو صورتحال سے بھی واقف ہوتا۔ لیکن چونکہ اسے نہ دیکھا تھا اس لئے سوال کرنا قدرتی بات تھی۔ اسی طرح وہ یہ جاننے کا خواہشمند ہے کہ شاگرد اسے کیا سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے متعلق اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے مقاصد کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔ لیکن اپنے بارے میں ان کے خیالات کو سمجھنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ سوالات کے ذریعے سے ان کے ایمان و عقیدے تک رسائی حاصل کرتا ہے (مرقس ۸ : ۲۷ - ۲۹)۔ مختصر یہ کہ انجیل مقدس معلومات حاصل کرنے کے لئے یسوع کو وہی طریقے بروئے کار لاتے ہوئے پیش کرتی ہے جو کہ ہم استعمال کرتے ہیں۔ وہ بھی ہماری مانند بشر تھا۔

علم کی ایک اور قسم بھی ہے جس کے ساتھ ابھی تک ہمارا پالا نہیں پڑا۔ لیکن وہی حقیقی علم ہے۔ فانی چیزوں یا دنیاوی خیالات و تصورات کا علم نہیں بلکہ دائمی چیزوں کا اور خدا کا علم ہے۔

اس وقت ہمارا موضوع خدا کے متعلق یسوع کی تعلیم کی قدر و قیمت اور اس کا اختیار نہیں ہے بلکہ ہمارے سامنے یسوع کی بشریت کی حقیقت ہے۔ اس وجہ سے ہمیں انسانی نقطہ نگاہ سے یسوع کے تجربے پر مودبانہ انداز میں بحث کرنا ہے۔

اگلے باب میں ہم خدا کے ساتھ اس کے لاثانی تعلق کے بارے میں

آگاہی کے متعلق پڑھیں گے مگر فی الحال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم انجیل جلیل کی شہادت پر غور کریں کیونکہ خدا کے متعلق اس کے تجربے کو معلوم کرنے کا یہی ذریعہ ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آیا یسوع اپنے زہد و پارسائی کے اعتبار سے بھی انسانی فطرت کا مالک تھا۔ خدا کے متعلق انسانی تجربے کا عام ذریعہ کیا ہے؟ تمام لوگوں کا ضمیر ہوتا ہے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر ان کا تعلق کسی مذہب سے ہے تو پھر ضمیر ان کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ضمیر سے کیا مراد ہے؟ یہ درست طرز عمل کے لئے حتمی راہنمائی کے طور پر اس قدر بکثرت استعمال ہوتا ہے کہ بعض اوقات یوں لگتا ہے گویا کہ انسان نے اسے خدا کا درجہ دے دیا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ جو شخص اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا ہے ہمیشہ اچھے طرز عمل کا ہی مظاہرہ کرے۔ سابق امریکی صدر ابراہام لنکن کے ضمیر نے اسے خبردار کیا کہ غلامی ناروا ہے لیکن اس کے بہت سے ہم وطنوں نے بالکل ایسا محسوس نہ کیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو کردار کے اعتبار سے تو بہت اعلیٰ تھے مگر اس ضمن میں اس کی ڈٹ کر مخالفت کرتے اور غلامی کو جائز قرار دیتے تھے۔ ان میں سے متعدد لوگ بہت مذہبی تھے جو غلامی کو حکم خداوندی کہتے تھے۔ پھر ضمیر کیا ہے ؟ اس کا موازنہ اپنے افعال و کردار کو پرکھنے والی کسوٹی کے ساتھ کرنے پر شاید ہم اس کی بہترین تعریف پیش کر سکیں۔ پس اس طرح ضمیر مذہبی تجربے کا ذریعہ بن سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔ مذہبی آدمی کے لئے خدا کی حیثیت سب سے بڑھ کر ہوتی ہے اور اگر وہ آدمی مسیحی ہو اور خدا سے

محبت رکھتا ہو تو اس کے لئے سب سے اعلیٰ چیز روحانی محبت ہے۔ لہٰذا ضمیر کی آواز محبت کی آواز ہے اور اسی کے ذریعے وہ اپنے افعال و کردار کو جانچتا ہے۔ یوں ہر وہ عمل جو محبت سے خالی ہو برائی اور گناہ ہو گا۔ اگر ہم خدا کو محبت نہیں بلکہ کچھ اور تصور کریں تو پھر ضمیر کی آواز محبت کی آواز تو نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہو گا! انجیل مقدس کا مطالعہ کرنے پر ہم یسوع کو بھی ایسا ہی کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ ہر شے کو پرکھتا ہے اور پھر اپنے اعلیٰ معیار یعنی محبت کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

انجیل مقدس میں یسوع کی آزمائش کا بیان یوں مرقوم ہے : "پھر ابلیس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس نے کہا اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴ : ۸ - ۱۰) یہاں یسوع کا المسیح ہونا حقیقت مانا جاتا ہے اور اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ اس زمانے کے یہودی اس سے کیا امیدیں وابستہ رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسے بادشاہ اور فاتح کی آمد کے منتظر تھے جسے انہیں رومی جوئے سے آزاد کرانا اور یروشلیم کے مقام پر اپنی عالیشان حکومت کی بنیاد رکھنا تھی۔ کیا یسوع کا مقصد بھی یہی تھا؟ ایک یہودی کے لئے جس کے نزدیک خدا صرف یہودیوں کا خدا تھا شاید ایسا عقیدہ فطری بات ہو، مگر یسوع جس کی تعلیم کے مطابق خدا محبت ہے اور تمام نسل انسانی کا باپ ہے کے ہاں ایسا ایمان ناپید تھا۔ وہ ہر چیز کو

اسی کے مطابق پرکھتا تھا۔ انجیل مقدس اس بات کی واضح شہادت پیش کرتی ہے۔ وہ ایک یہودی گھرانے میں پروان چڑھا اور بخوبی جانتا تھا کہ ایک یہودی سبت کی پابندیوں کے بارے میں کس قدر کٹر ہوتا ہے' مگر اس نے اس سخت پابندی کی بہت ملامت کی۔ اگر سبت کی پابندی کرنے والا کوئی شخص خدا کی محبت سے خالی ہے تو اس کی دینداری کے تمام دعوے باطل ٹھہرتے ہیں۔ اسی لئے روایتی قوانین جو کسی فرد کو اس کے فرزندانہ فرائض اور ذمہ داریوں سے روکتے تھے اس کی مذمت کا شکار ہو گئے۔ محبت سے خالی ہونے کی وجہ سے وہ خدا سے دور تھے اور اپنے باپ یا ماں کے لئے دکھ اٹھانا انہیں گوارا نہیں تھا (مرقس ۳ : ۱-۶، ۷ : ۹-۱۳)۔

بحیثیت انسان یسوع کی پارسائی اس وقت کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم ان ذرائع پر غور کرتے ہیں جن کی بدولت اس کا مذہبی تجربہ برقرار رہا۔ جب ضمیر مذہبی تجربے کا وسیلہ بن جاتا ہے اور آدمی خدا کا عرفان حاصل کر لیتے ہیں تو پھر ایک ضرورت کا عظیم احساس نمودار ہونے لگتا ہے جس کا اظہار پرستش میں پایا جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس بات کی وضاحت بھی ہو جائے کہ پرستش سے ہماری مراد کیا ہے؟ حقیقی عبادت کا مطلب خدا سے رفاقت رکھنا ہے۔ اگر ہم سے کہا جاتا کہ یسوع کی زندگی جس کا انجیل میں انکشاف ہوا ہے کو صرف ایک فقرے میں بیان کریں تو ہم شاید اس سے بہتر کچھ نہ کہہ سکتے کہ اس کی زندگی ایک دعائیہ زندگی تھی اور ایسی زندگی جس کا خدا کے ساتھ مضبوط ربط تھا۔ شروع ہی سے وہ اپنی روزانہ مخصوص دعا کے لئے شاگردوں کو چھوڑ کر

تنہائی میں دعا کیا کرتا تھا۔ سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے ویرانے یا پہاڑ کی خاموشی میں خدا سے رفاقت رکھنا اس کا معمول تھا۔ وہ گلیلی مچھیرے صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے مگر وہ ان سے بھی پہلے بیدار ہو جاتا تھا۔ رسول اپنی حیرانی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے "اور صبح ہی دن نکلنے سے بہت پہلے وہ اٹھ کر نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا کی" (مرقس ۱ : ۳۵)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے نازک لمحات میں یا عظیم و اہم فیصلے کرنے کے موقعوں پر اس نے دعا کی۔ یوحنا اصطباغی سے بپتسمہ لینے اور اس سے وابستہ عظیم روحانی تجربہ، خدمت کے آغاز اور بارہ شاگردوں کے چناؤ سے قبل اس نے کچھ وقت خدا کی قربت میں گزارا (لوقا ۶ : ۱۲ - ۱۶)۔ یروشلیم کی طرف آخری سفر کے وقت بھی اس نے دعا کی جب یہ حقیقت بالکل عیاں ہو چکی تھی کہ اس کے شاگرد اس کے مشن کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں اور تنہائی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ وہاں پہاڑ پر اس کی صورت بدل گئی (پڑھئے لوقا ۹ : ۲۸ - ۳۶)۔ صلیبی موت سے پہلے گتسمنی باغ میں نہایت بڑی روحانی اذیت کے عالم میں اس نے دعا کی (مرقس ۱۴ : ۳۲ - ۳۴)۔ بحیثیت انسان وہ خدا کے بارے میں انسانی ضرورت سے واقف تھا اور دعا و رفاقت کی صورت میں اس نے اس ضرورت کی تسکین پائی۔ خدا کے ساتھ بے مثل تعلق کی وجہ سے وہ اپنی الوہیت سے بھی واقف تھا جس کے بارے میں ہم اگلے باب میں پڑھیں گے۔ بپتسمے کا منظر ظاہر کرتا ہے کہ یسوع اب اپنے ابن اللہ ہونے کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پہلی آزمائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ایمان نے اس شعور کو برقرار

رکھا (متی ۳ : ۱۶ - ۴ : ۴)۔ شیطان کی آواز پر یسوع نے یہ جواب دیا "آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے۔" اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی تمام زمینی زندگی کے دوران اسی اصول پر کاربند رہا۔

پس ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گلیل کی پہاڑیوں پر چلنے والا یسوع ایک حقیقی انسان تھا جو ہماری طرح خواہشات و جذبات رکھتا تھا اور انسانی تجربات سے گزرا۔ ہم اس سے محبت رکھتے ہیں کیونکہ ہم اسے جان سکتے ہیں اور ہم اسے اس لئے جان سکتے ہیں کیونکہ وہ ہم جیسا انسان تھا۔ تاہم یسوع ان تمام باتوں کے باوجود کچھ اور بھی تھا۔

لے یہ اصطلاح انسانی رشتے کا اظہار بالکل نہیں بلکہ ابن' بیٹا یا کلام جیسے الفاظ ایک روحانی اور الٰہی تعلق کی نشاندہی کرتے ہیں۔

باب چہارم

ہم سے جداگانہ

یسوع المسیح کے ہم سے قطعاً مختلف ہونے کے بارے میں انجیل مقدس میں بہت کچھ مرقوم ہے۔ پہلے ہم اس بات پر غور کریں گے کہ وہ کس لحاظ سے ہم سے مختلف تھا۔ بعدازاں یسوع کے طرز عمل اور اس کے امتیازی اوصاف پر نظر کریں گے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اس سے آگاہ تھا۔

یسوع المسیح نے اپنے مشن کے آغاز میں لوگوں کو توبہ کی دعوت دی۔ وہ دوسروں پر تو زور دیتا تھا کہ انہیں گناہوں سے معافی پانے کے لئے توبہ و استغفار کی ضرورت ہے مگر اس نے خود کبھی بھی یہ محسوس نہ کیا کہ وہ بھی معافی کا حاجت مند ہے' حتیٰ کہ بپتسمہ جو دوسروں کے لئے توبہ کی علامت تھا اس کے لئے مختلف معنی رکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر انجیلی بیانات کے مطابق وہ ایک بے گناہ شخصیت کا مالک تھا۔

اناجیل متوافقہ (متی' مرقس' لوقا) میں کہیں نظر نہیں آتا کہ ان کے مصنفین نے دیدہ و دانستہ مسیح کو بے گناہ ثابت کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ تو بھی یہ بیانات پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن میں یہی بات راسخ ہو جاتی ہے کہ یسوع المسیح میں گناہ حتیٰ کہ کسی معمولی اخلاقی کمزوری کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

چنانچہ اسے اس حقیقت کا شعور تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ مکمل رفاقت رکھتا ہے۔

پاکیزگی کے اس احساس سے یسوع المسیح کو ایک لاثانی شخصیت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ کوئی شخص روحانی طور پر جس قدر زیادہ ترقی کرتا ہے اسی قدر اس میں گنہگاری و ناپاکی کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ آیئے انبیائے کرام کے تجربے پر غور کریں۔ جب باری تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو نبوت کے لئے چنا تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اس کام کے بالکل اہل نہیں (خروج ۳ : ۱۱)۔ حضرت جدعون (قضاۃ ۶ : ۱۵)' حضرت سلیمان (۱-سلاطین ۳ : ۱۱) اور حضرت یرمیاہ (یرمیاہ ۱ : ۶) کو اپنی نااہلی کا پورا پورا احساس تھا۔ حضرت یسعیاہ بھی اپنی گنہگاری کے احساس سے مغلوب تھے (یسعیاہ ۶ : ۵)۔ لیکن اس قسم کا احساس یسوع المسیح کے کبھی قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔ حضرت یسعیاہ کی طرح یسوع المسیح کے مشن کا آغاز بھی ایک الٰہی رویا سے ہوا (مرقس ۱ : ۱۰ - ۱۱)۔ لیکن جہاں خدا کی قدوسیت کی رویا نے نبی کو اس کی کم مائیگی اور گنہگاری کا گہرا احساس دلایا وہاں آسمانی رویا نے یسوع المسیح کو اس کی خدا کے ساتھ کامل شراکت کی تسلی دلائی اور اس کی تصدیق کی۔

اب اسی یسوع کو دوسروں کے گناہوں کا اور اس دنیا کی بدیوں کا گہرا احساس تھا۔ چنانچہ لازم آتا ہے کہ یا تو وہ لاثانی معنوں میں ابن اللہ ہے جیسے کہ بپتسمہ کے وقت آسمان سے آواز آئی یا وہ دنیا جہان کے تمام انسانوں سے زیادہ خامیوں کا مالک ہے' کیونکہ اپنے نقائص سے غافل ہونا اور دوسروں پر انگلی دھرنا

بذات خود بہت بڑی خامی ہے۔ اگر یسوع ایسی شخصیت کا مالک ہوتا تو لوگ اس کی جانب کھنچے چلے نہ آتے بلکہ اس سے گھن کھاتے ہوئے دور بھاگتے۔ اس کا غرور و تکبر اور خودغرضی لوگوں کو اس کے قریب نہ آنے دیتی کیونکہ وہ اس کی ذات میں پائی جانے والی خرابیوں کو فوراً بھانپ لیتے۔ منافق شخص دوسروں کے دل جیتنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یسوع المسیح کے تجربے میں بھی ایسے شخص آئے جیسے کہ اس کی اپنی تمثیل سے ظاہر ہے (پڑھئے لوقا ۱۸ : ۹ - ۱۴)۔ فریسی ہیکل میں کھڑا ہو کر یوں دعا کرتا ہے "اے خدا میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ باقی آدمیوں کی طرح . . . نہیں ہوں۔" کیا اس فریسی کا کردار اس کی زبان سے مطابقت رکھتا تھا؟ فی الحقیقت اس کی دعا اسے بہت بڑا منافق اور آدم بے زار شخص بنا دیتی ہے۔ اس نے نہ اپنے جاننے والوں کو متاثر کیا اور نہ ہم پر ہی کوئی اثر چھوڑتا ہے۔ اس کے برعکس پطرس نے المسیح کے قدموں میں گر کر کہا "اے خداوند! میرے پاس سے چلا جا کیونکہ میں گنہگار آدمی ہوں" (لوقا ۵ : ۱۸)۔ یسوع کی بے گناہی ایک مثبت حقیقت ہے یعنی کامل پاکیزگی۔ یہاں ہمیں کوئی فریسی نظر نہیں آتا جو خداوند کا شکر کرتا ہے کہ وہ دیگر آدمیوں جیسا نہیں بلکہ یہاں وہ ہے جس کے ہر عمل اور ہر لفظ سے ناقابل تردید پاکیزگی ٹپکتی ہے اور وہ اب بھی دوسروں میں اچھائی دیکھنے پر آمادہ ہے۔ فریسی جو کہ اپنی برائیوں سے بے خبر ہے دوسروں کے بارے میں فیصلہ سنانے میں سب سے بڑھ کر سخت دل ہے جبکہ یسوع جو اپنی کامل پاکیزگی سے بخوبی آگاہ ہے گنہگاروں اور بدکاروں کے معاملے میں سب سے زیادہ رحم دل ہے۔

خدا کے ساتھ یسوع کی وہ کامل رفاقت جو بپتسمہ کے وقت نظر آتی ہے اس کی زمینی زندگی میں برقرار رہی۔ صرف بپتسمہ کے وقت ہی خدا اور یسوع المسیح میں رفاقت کا آغاز نہیں ہوا بلکہ یہ تعلق تو ازل سے قائم تھا۔ اگر بپتسمے سے پہلے اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات رونما ہوتی جس کے باعث خدا سے دوری کا احساس پیدا ہوتا تو وہ اسے کبھی بھول نہ سکتا۔ اس کے برعکس پولس رسول کو تازندگی اپنا وہ گناہ یاد رہا کہ اس نے خدا کی کلیسیا کو ستایا تھا (افسیوں ۳ : ۸)۔ لیکن جہاں تک یسوع کا سوال تھا سو کوئی ایسی بری یاد موجود ہی نہ تھی جو خدا کے ساتھ یگانگت کی روشنی کو ماند کر سکتی۔ بپتسمہ کے وقت آسمان سے آواز آنے کا محض یہ مقصد تھا کہ یسوع المسیح کو اس حقیقت کا مکمل احساس دلایا جائے کہ وہ سچ مچ ابن اللہ ہیں۔

وہ کامل پاکیزگی جس نے اسے دوسرے انسانوں سے ممتاز اور یکتا بنا دیا اس کی لاثانی شخصیت کا ظاہری اظہار تھی۔ حقیقی پاکیزگی میں نجات کا عمل پایا جاتا ہے۔ جب حضرت یسعیاہ کو خدا تعالیٰ کی قدوسیت کا احساس ہوا تو ان کے اپنے گناہ بھی ان پر ظاہر ہونے لگے۔ انہیں احساس ہوا کہ انہیں معافی کی ضرورت ہے۔ حقیقی پاکیزگی پاک کرتی ہے۔ یہ نہ صرف گناہ ظاہر کرتی ہے بلکہ اس سے پاک بھی کرتی ہے۔ بعینہٖ یسوع المسیح کی پاکیزگی نے بھی لوگوں کو ان کے گناہوں کا شعور بخشا اور پھر انہیں مخلصی عطا کی۔ "بیٹا تیرے گناہ معاف ہوئے" ایسے الفاظ تھے جنہوں نے فقیہوں کو چونکا دیا (مرقس ۲ : ۱ - ۱۲)۔ لیکن یہ الفاظ تو یسوع المسیح کی زبان مبارکہ سے قدرتی طور سے صادر ہوئے

تھے۔ فقیہوں کا یہ اعتراض بھی اس حقیقت کا گواہ ہے کہ وہ بھی یسوع المسیح کی پاکیزگی کی نجات بخش نوعیت سے آگاہ تھے۔ "خدا کے سوا گناہ کون معاف کر سکتا ہے؟" وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ المسیح نے جس کسی سے بھی ایسے الفاظ کہے کسی نے بھی اس کے اختیار پر اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ اس کی پاک کرنے والی قدرت سے واقف تھے اور یہ الفاظ اس کا محض ظاہری اظہار تھے۔ اگر کامل پاکیزگی جو گناہ معاف کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے صرف حق تعالیٰ کی صفت ہے تو پھر یسوع کو محض ایک بشر نہیں کہا جاسکتا۔ وہ خود جانتا تھا کہ خدا اور اس کے مابین ایک لاثانی رشتہ قائم ہے جس میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا۔ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایسی صفات کا مالک ہے جو صرف اور صرف خداتعالیٰ کی ذات بابرکات میں ہی پائی جا سکتی ہیں (لوقا ۷ : ۱۹)۔

اس کے ابن اللہ ہونے کے یقین کا واضح ترین اظہار اس کے مسیح موعود ہونے کے شعور سے ہوتا تھا۔ اس کے زمانے کے یہودی توقع رکھتے تھے کہ ایک شخص آئے گا جو انہیں رومی حکومت کے جوئے سے رہائی دلائے گا اور حضرت داؤد کے تخت پر سلطنت کرے گا۔ لیکن المسیح نے انہیں بتایا کہ وہ دکھ اٹھائے گا' رد کیا جائے گا اور اپنے جلال میں داخل ہونے کے لئے جان قربان کر دے گا۔ یسوع المسیح نے یسعیاہ نبی کے صحیفے کے دکھ اٹھانے والے خادم (یسعیاہ ۵۳ : ۴ - ۱۱) اور حضرت دانی ایل کی آدم زاد والی رویا (دانی ایل ۷ : ۱۳) کے بیان کا اپنے پر اطلاق کیا مگر اس کے قریب ترین حواری ایسی تعلیم کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔

یسوع کے اس تصور کو کہ وہی المسیح (مسیح موعود) ہے سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم اس کے اختیارکردہ لقب "ابن آدم" پر غور کریں۔ ہر انجیل نویس نے اپنے مخصوص طریقے سے انجیل کا بیان کیا۔ مثال کے طور پر حضرت متی نے یسوع المسیح کی تعلیمات کو نفس مضمون کے مطابق کئی خطبات کی صورت میں جمع کیا۔ حضرت لوقا نے متعدد روایات کو اپنی انجیل کی بنیاد بنایا (لوقا ۱ : ۱ - ۲)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مرقس نے یسوع المسیح کے حالات زندگی، معجزات اور تعلیمات حضرت پطرس کی یادداشت کی مدد سے درج کئے۔ اس لقب کا مطلب سمجھنے کے لئے جسے یسوع نے اکثر اپنے لئے استعمال کیا مرقس کی انجیل بہترین راہنما ثابت ہوتی ہے۔ مسیح موعود کا عام لقب "ابن داؤد" تھا۔ لیکن یسوع المسیح نے یہ لقب اپنے لئے خود استعمال نہ کیا کیونکہ اہل یہود میں مسیح موعود کے بارے میں یہ تصور عام تھا کہ وہ داؤد کے تخت پر بیٹھ کر یہودی بادشاہ کی حیثیت سے سلطنت کرے گا اور انہیں رومی حکومت سے آزاد کروائے گا۔ چنانچہ اس لقب سے زیادہ تر دنیاوی بادشاہت کا تصور ابھرتا تھا۔

پھر "ابن آدم" کے لقب سے کیا مراد ہے؟ مرقس کی انجیل میں یسوع المسیح نے اپنے لئے بارہ مرتبہ ابن آدم کا لقب استعمال کیا ہے۔ حضرت حزقی ایل اور حضرت دانی ایل کی پیشین گوئیوں میں اسی لقب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ دانی ایل نبی نے رویا میں ایک ایسا شخص دیکھا جو دیکھنے میں آدم زاد کی مانند تھا مگر اس کی سلطنت دائمی تھی۔ "اور سلطنت اور حشمت اور مملکت اسے دی گئی تاکہ سب لوگ اور امتیں اور اہل لغت اس کی خدمت گزاری کریں۔

اس کی سلطنت ابدی سلطنت ہے جو جاتی نہ رہے گی اور اس کی مملکت لازوال ہوگی" (دانی ایل ۷ : ۱۴)۔

چنانچہ لقب "ابن آدم" نے دنیاوی چیزوں سے توجہ ہٹا کر الٰہی چیزوں کی طرف مبذول کرا دی۔ یسوع نے اس بات پر زور دیا کہ اس کی بادشاہی دنیا کی نہیں۔ اس وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ اس کے مفہوم میں یہ بات داخل ہو کہ وہ دکھ اٹھائے اور صلیبی موت کے بعد اپنے جلال میں داخل ہو۔ اگر یہ دریافت کیا جائے کہ یسوع نے مسیح موعود ہونے کا لاثانی تصور کیسے حاصل کیا تو اس کا ایک ہی جواب ممکن ہے۔ اس تصور نے اس کے اس شعور سے جنم لیا کہ خدا اور اس کے مابین ایک بے نظیر تعلق قائم ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فی الحقیقت ابن خدا ہے۔ اسی سے اس کا مسیح موعود ہونے کا شعور ابھرا۔ اس لئے اہل یہود کی امیدوں پر پورا اترنا (ان کا بادشاہ بننا) اس کے لئے ناممکن ہو گیا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے دور کے ہر یہودی کی طرح عبرانی صحائف کا مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ لیکن اس نے نوشتوں کی توضیح و تشریح کے معاملے میں غیر معمولی تخلیقی قوت کا مظاہرہ کیا کیونکہ اس نے ایسے شخص کی طرح ہر چیز کو اپنے منفرد زاویہ نظر سے پرکھا جس کی زمینی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدا باپ کی قربت میں گزرتا تھا۔ اس کے منہ کا ہر لفظ اور اس کا ہر عمل اس کے لاثانی ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی یہی انیت اس کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔

آیئے پرستش کے بارے میں اس کی تعلیم اور اس کی اپنی دعائیہ زندگی پر غور کرتے ہیں۔ اس نے اپنے حواریوں کو سکھایا کہ وہ یوں دعا کیا کریں "اے

ہمارے باپ . . . " (متی ۶ : ۹) لیکن وہ آپ خدا کو "اے ہمارے باپ" ہرگز نہیں کہتا بلکہ ہمیشہ "تمہارا باپ" یا "میرا باپ" (متی ۵ : ۴۸، ۶ : ۸، ۱۵، ۷ : ۲۱، ۱۰ : ۳۲)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ ایک بے مثل اور جداگانہ رشتہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ باری تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمارے اندر نااہلیت اور گنہگاری کا احساس جنم لیتا ہے۔ پھر ندامت و پشیمانی کا خیال پیدا ہوتا ہے اور بعدازیں معافی و بخشش کے لئے التجا کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بڑے بڑے عابد اور پارسائی کے دعویداروں نے بھی بارگاہ رب العزت میں اپنے گناہوں اور خطاؤں کے لئے استغفار کیا۔ لیکن یسوع المسیح نے توبہ اور معافی کی کبھی حاجت محسوس نہ کی کیونکہ اس کی ذات اقدس ہر قسم کے گناہ سے مبرا تھی اور وہ خدا باپ کے ساتھ کامل رفاقت رکھتا تھا (یوحنا ۸ : ۴۶، ۱ - یوحنا ۳ : ۵)۔ عبادت کے معاملے میں اسے اپنے عزیز ترین پیروکاروں سے بھی علیحدہ زندگی گزارنا پڑی۔ انسان ہونے کے باوجود وہ ہم سب سے قطعی جداگانہ فطرت کا مالک تھا۔

یہی " جداگانہ فطرت " اس کے تمام دعوؤں کی بنیاد اور اصل ہے۔ اس کی زبان صداقت بیان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ معتبر، پتھر پر لکیر اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے (متی ۲۴ : ۳۵)۔ وہ صاحب اختیار کی طرح کلام کرتا ہے اور سننے والے پر رعب طاری ہو جاتا ہے (مرقس ۱ : ۲۷، متی ۷ : ۲۸ - ۲۹)۔ اگرچہ شریعت اس کی نظر میں مقدس تھی تو بھی وہ اپنے آپ

کو اس سے اعلیٰ اتھارٹی قرار دینے سے ہرگز نہیں ہچکچاتا۔ "لیکن میں تم سے کہتا ہوں . . . " (متی ۵ : ۲۲، ۲۷، ۳۴، ۳۹ وغیرہ) کے الفاظ اس کے صاحب اختیار ہونے کا بین ثبوت ہے۔

وہ بڑے اختیار کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو دعوت دیتا ہے "میرے پیچھے چلے آؤ" (متی ۴ : ۱۹، مرقس ۱ : ۱۷)۔ وہ ان سے اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ اس کی خاطر اپنے گھر بار، عزیز و اقارب اور حتیٰ کہ جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہیں (متی ۱۰ : ۳۷ - ۳۹، مرقس ۸ : ۳۴ - ۳۸، لوقا ۹ : ۵۹ - ۶۲)۔ نہ صرف اس کے شناساؤں نے بلکہ ان کے علاوہ بیشمار لوگوں نے بھی اس کی آواز پر لبیک کہا۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ انجیل مقدس کا یہ یسوع ہماری طرح حقیقی بشر ہونے کے باوجود ہم سے جداگانہ ہستی ہے۔ اس کی قدرت و اختیار کا مشاہدہ کرنے پر عوام الناس اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ ان سے قطعی مختلف فطرت کا مالک ہے۔ تاہم پہلے پہل وہ اس کی شخصیت کو سمجھنے میں ناکام رہے لیکن وہ خود اپنی حقیقت و اصلیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ عوام حیران ہو کر صرف یہی کہہ سکی "یہ آدمی کون ہے؟" لیکن یسوع نے کہا "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے" (متی ۱۱ : ۲۷)۔ اس کی پاکیزگی، بے گناہی، گناہوں سے پاک کرنے کی قدرت، مسیح موعود کی حیثیت سے اس کا لاثانی کردار، اس کی حیرت انگیز دعائیہ زندگی، اس کا معتبر کلام اور اس کے تعجب

انگیز دعوے، ان سب کا سرچشمہ یسوع المسیح کا یہ شعور ہے کہ وہ فی الحقیقت ابن خدا ہے۔

باب پنجم

یسوع المسیح حواریوں کے تجربے میں

پچھلے باب میں ہم نے اناجیل اربعہ کی روشنی میں یسوع المسیح کے کردار اور شخصیت پر غور کیا اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ اپنی نگاہ میں کس حد تک انسان اور کس حد تک انسان سے جداگانہ ہے۔ اب ہم اس کی عملی زندگی پر غور کریں گے جس نے اس کے پیروکاروں کو مجبور کر دیا کہ وہ اُسے اپنا خداوند مانیں اور اس کی پرستش کریں۔

انجیل مقدس بتاتی ہے کہ اس کے حواریوں نے بیشتر اس کے کہ اس کی شخصیت کی حقیقت کو سمجھتے' اس کی قدرت کا مشاہدہ کیا اور اس سے بیشتر کہ انہوں نے اپنے عقیدہ کو تشکیل دیا وہ اس کی پرستش کرنے لگے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر جتنا زیادہ زور دیا جائے کم ہے۔ یہ گناہوں سے پاک کرنے والی اس کی قدرت تھی جس کے باعث انہوں نے اس میں خدا کو پا لیا۔ یہی تجربہ ہمیں بھی اس کی پرستش کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ سوائے اس کی قدرت کے تجربے کے کوئی دلیل یا کوئی الہامی کتاب ہمیں اس پر زندہ ایمان نہیں عطا کر سکتی۔ لیکن ان لوگوں کی شہادت جنہوں نے اپنی آنکھوں سے المسیح کے کردار' زندگی کو تبدیل کرنے والی اور نجات بخش قدرت و اختیار کا مشاہدہ کیا ہماری مدد

کر سکتی ہے کہ ہم بڑی دلیری کے ساتھ ایمان لا کر اس کی آواز پر لبیک کہیں۔ اگرچہ یہ مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے مگر اس سے ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ مسیحیت کو سچا ثابت کرنے کی کوشش ہے یا مسیحی ایمان کی حمایت میں کچھ کہا جارہا ہے۔ ایسا ایمان جس نے دنیا کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہو کسی قسم کی حمایت اور سہارے کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب تبدیل شدہ زندگیاں اس کی قدرت کی شہادت دیتی ہیں تو پھر مزید کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔ نیا عہدنامہ نہ صرف تبدیل شدہ لوگوں کی گواہی کا ریکارڈ ہی ہے بلکہ یہ آج بھی بیشمار لوگوں کی زندگی کی تبدیلی کا موجب بن رہا ہے۔

کسی بھی عظیم شخص کی داستان حیات کے متعلق ہمارا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ کسی بھی شخصیت کی سوانح عمری کو ذہن میں لائیے جسے آپ پڑھ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر بانی پاکستان قائداعظم کی زندگی ہی کو لے لیجئے۔ جب تک ہم ان کے ہمعصر، انہیں جاننے اور ان سے محبت رکھنے والے لوگوں کی آراء اور خیالات سے آگاہ نہ ہوں ان کی زندگی کا مطالعہ ادھورا ہی رہتا ہے۔ سوانح عمری کے ہر بحران اور مشکل وقت میں ہم آنے والے واقعات کے متعلق بے چینی محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ان کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے ہم آرزو کرتے ہیں کہ وہ حالات کا مقابلہ کریں اور درست قدم اٹھائیں۔ ہم ہر بحران کے موقعے پر ان کے پیروکاروں اور دوستوں کے احساسات کو نئے طور سے محسوس کرتے ہیں۔ ہم ہر مشکل وقت کے دوران پیدا ہونے والے ان کے اضطراب میں شامل ہوتے ہیں۔ نیز مشکل حالات پر فتح پانے کی صورت میں ہم ان کی خوشی

میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ قطع نظر اس بات کے کہ ہم کس کی سوانح حیات پڑھتے ہیں' اگر اس نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہماری ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں تو پھر ہمیں راحت بخش لمحات کے ساتھ ساتھ تکلیف دہ ساعتوں کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔

اگر مذہبی تعصب سے پاک ہو کر انجیل جلیل کا مطالعہ کریں تو ہم پر ایک دلچسپ حقیقت منکشف ہو گی۔ وہ یہ کہ یسوع کی شخصیت ہمیں اپنی طرف راغب کرتی ہے اور بحیثیت ہیرو وہ نہایت اطمینان بخش ہے۔ اس کی رفاقت میں کچھ ہی عرصہ گزارنے کے بعد ہمیں خودبخود ہی احساس ہونے لگتا ہے کہ تمام مشکل حالات میں اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ وہ بوکھلا نہیں جاتا کہ کیا کرے بلکہ یوں دکھائی دیتا ہے کہ وہ پیدا ہونے والے ہر قسم کے حالات پر قادر ہے۔ اگر ہم پر محض تحریری ریکارڈ اس طرح کا اثر چھوڑ سکتا ہے تو اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ شخصیات کس قدر متاثر ہوئی ہوں گی جنہوں نے یسوع کو جسم میں دیکھا اور اس پر اپنا پورا پورا بھروسا رکھا تھا۔ تاہم ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مختصر عرصے میں تحریری ریکارڈ سے اخذ شدہ ہمارے احساسات یسوع کے شاگردوں کے احساسات کا عکس ہی ہو سکتے ہیں' اس لئے کہ وہ روزمرہ زندگی میں اپنے آقا کے ہمراہ رہے۔

یسوع کی شخصیت کو سمجھنے اور جاننے کے لئے شاگردوں کے پاس بہت سے موزوں مواقع تھے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ خود دن رات اس کی قربت میں رہتے اور اس کی ذات کا اثر قبول کرتے تھے بلکہ انہیں المسیح کا دوسروں کو

متاثر کرتے ہوئے دیکھنے کا بھی شرف حاصل تھا۔ ان کی زندگی میں طلوع ہونے والا ہر نیا دن نئے تعلقات لے کر آتا تھا' ہر نیا تعلق نئے احساسات کا باعث بنتا تھا اور ہر نیا احساس ایک ایسے اثر کو جنم دیتا تھا جو ان کے اپنے کردار کو بدلنے کا سبب بنتا تھا۔ ہم ان کے بعض تجربات میں آج بھی شریک ہو سکتے ہیں' کیونکہ انہوں نے انجیل مقدس کے صفحات میں ہمارے لئے غیر معمولی دیانتداری کا اعلیٰ نمونہ چھوڑا ہے۔ انجیل منورہ ان باتوں اور واقعات کا ریکارڈ ہے جو انہوں نے یسوع کے ساتھ رہ کر اپنے کانوں سے سنے اور آنکھوں سے دیکھے۔ اور ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے غیر شعوری طور پر المسیح کے اثر کو قبول کیا ہے۔ ہم وہی کچھ دیکھ سکتے ہیں جو کہ انہیں دیکھنا نصیب ہوا بلکہ ان سے بڑھ کر دیکھ سکتے ہیں کیونکہ ہمیں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ رفتہ رفتہ ان کی اپنی زندگیاں کیسے تبدیل ہوتی گئیں۔

آیئے شاگردوں کے ابتدائی تجربات میں سے چند ایک پر غور کریں جو انہیں یسوع کی قدرت اور اختیار کے متعلق حاصل ہوئے۔

اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یسوع کے بعض ابتدائی شاگرد کیونکر دائرہ شاگردیت میں داخل ہوئے تو ہمیں یوحنا رسول کی معرفت لکھی گئی انجیل کی طرف رجوع کرنا ہوگا (۱ : ۳۵ - ۵۱)۔ اگرچہ یسوع کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات کا ذکر یہاں بہت مختصر ہے تو بھی ہمارے یہ جاننے کے لئے کافی ہے کہ وہ المسیح کے ساتھ واقفیت کی ابتدا ہی سے اس احساس سے مغلوب تھے کہ وہ لاثانی ذات اور عظیم اختیار کا مالک ہے۔ بس اسی مقام سے انہوں نے اس کی

آواز پر لبیک کہا اور اپنا سب کچھ ترک کر کے اس کے پیچھے ہو لئے۔

اس جہان میں آج تک ایسی شخصیت نہیں پیدا ہوئی جس نے یسوع کی عظیم شخصیت سے بڑھ کر لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہو۔ اب ایک اور قابل توجہ بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ ماہی گیروں کا ایک گروہ ایک ایسے شخص کی دعوت پر اپنے جال اور گھربار چھوڑنے پر راغب ہو جاتا ہے جس کے متعلق جاننے کے لئے اسے ابھی تک کوئی حقیقی موقع نہیں ملا۔ ان آدمیوں کا بلا چون و چرا یسوع کی پیروی میں لگ جانے کی حقیقت اس کی شخصیت کی قدرت اور اس کے منہ کے الفاظ کے اختیار کی گواہی کو مزید زور دار بنا دیتے ہیں (مرقس ۱ : ۱۶ - ۱۹)۔ یہ ایک ایسا اختیار تھا جو دوسروں میں اعتماد اور بھروسے کو جنم دیتا تھا اور شاگردوں کا ردعمل ان کے ایمان کی آزمائش تھی اگرچہ وہ خود اس حقیقت سے شاید واقف نہ تھے۔

ان کا پہلا ہوشمندانہ عمل ان کی بے مثل فرمانبرداری یعنی یسوع کے اختیار اور اس کی طرف کھنچے چلے آنے والے لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے والی اس کی قدرت کو خراج تحسین پیش کرنا تھا۔ اس کے بعد تجربات کا ایک مسلسل عمل شروع ہوا۔ انہوں نے لوگوں کے ہجوم پر یسوع کے الفاظ کے اثر کا مشاہدہ کیا (مرقس ۱ : ۲۱ - ۲۲)۔ انہوں نے بدروح گرفتہ پر اس کی شخصیت کے سکون اور شفا بخش اثر کو ملاحظہ کیا۔ انہوں نے اسے بخار میں مبتلا عورت کو صحت بخش ہاتھ سے چھوتے دیکھا۔ ان کے تجربے میں یہ بات بھی آئی کہ اس کی حضوری نے بیماروں اور ان کے وارثوں اور غم خواروں کے دلوں میں کس

طرح توقع، ایمان اور امید کی روح پیدا کی۔ ان کی نگاہوں سے غریب اور زمانے کے ردے اور دھتکارے ہوئے لوگ گزرے جو اس پر پورا پورا اعتماد کرنے لگے تھے۔ وہ اس بے مثل محبت پر ششدر رہ گئے جس نے ناپاک کوڑھی کو چھونے سے بھی گریز نہ کیا۔ اس شخص کے اس طرز عمل نے انہیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ جب دوسرے محوخواب ہوتے تھے تو وہ جنگل کی تنہائیوں میں خدا کی قربت و رفاقت میں وقت گزار رہا ہوتا تھا۔ وہ ابتدائی ایام واقعات و تجربات سے بھرپور تھے اور نت نئے تاثرات جنم لے رہے تھے۔ لیکن یہ کم و بیش غیرشعوری طور پر ان کی زندگیوں کا حصہ بن چکے تھے۔

ایک دن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ان پر ٹھوس اثر چھوڑا۔ یہ ان کا پہلا تجربہ تھا کہ یسوع المسیح اپنے مخالفین کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھتا ہے۔ انجیل جلیل کے مطابق پطرس بھی اس اہم واقعے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا (پڑھئے مرقس ۲ : ۱ - ۱۲)۔ گرد و نواح کے علاقوں میں یسوع المسیح کی کافی شہرت تھی۔ اس روز وہ کفرنحوم کے ایک گھر میں کلام سنا رہا تھا۔ لوگوں کی بھاری اکثریت اس گھر میں جمع ہو گئی یہاں تک کہ دروازے کے پاس بھی جگہ نہ رہی۔ دریں اثنا چار آدمی چارپائی پر ایک مفلوج کو وہاں لائے۔ حاضرین میں سے ہر کوئی یہ دیکھنے کا مشتاق تھا کہ یسوع مفلوج کو بھلا کیسے شفا دیتا ہے۔ لیکن چارپائی کو یسوع المسیح تک کیسے لے جایا جاتا کیونکہ گھر میں اور اس کے سامنے لوگوں کا بڑا ہجوم تھا؟ تاہم مریض کے دوستوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ مضبوط ایمان کے ساتھ یسوع المسیح تک پہنچنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ آخر انہیں

ایک ترکیب سوجھی۔ انہوں نے چھت کے راستے مکان میں داخل ہونے کی ٹھان لی۔ لیکن مفلوج کو چھت پر لے جانا بھی تو کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آخرکار انہوں نے مکان کی چھت ادھیڑ کر چارپائی اندر اتار دی۔

ہم تصور کر سکتے ہیں کہ اس عمل نے حاضرین کے ذہن پر کیا تاثر چھوڑا ہو گا۔ اس طرح کا ایمان پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس ایمان سے یسوع بلکہ سب لوگ بڑے متاثر ہوئے۔ چارپائی کی وجہ سے پورے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ تب المسیح نے اس سکوت کو توڑ ڈالا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بیمار شخص کی روح کے لئے تو تسلی و اطمینان کا موجب بنے مگر وہاں پر موجود فقیہ انہیں سن کر پیچ و تاب کھانے لگے۔ "بیٹا تیرے گناہ معاف ہوئے" ایسے الفاظ تھے جنہوں نے فقیہوں کو چونکا کے رکھ دیا۔ وہ اپنے دلوں میں سوچنے لگے "یہ کیوں ایسا کہتا ہے؟ کفر بکتا ہے۔ خدا کے سوا گناہ کون معاف کر سکتا ہے؟" یسوع المسیح نے فوراً بھانپ لیا کہ وہ اپنے دلوں میں کیا سوچ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "تم کیوں اپنے دلوں میں یہ باتیں سوچتے ہو؟ آسان کیا ہے؟ مفلوج سے یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یا یہ کہنا کہ اٹھ اور اپنی چارپائی اٹھا کر چل پھر؟ لیکن اس لئے کہ تم جانو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے۔ اس نے اس مفلوج سے کہا' میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ اپنی چارپائی اٹھا کر اپنے گھر چلا جا اور وہ اٹھا اور فی الفور چارپائی اٹھا کر ان سب کے سامنے باہر چلا گیا۔" یہ سننے اور دیکھنے پر فقیہوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں اور اس کے جواب میں انہیں ایک لفظ کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ یہ آدمی

کون تھا جس نے ان کے دلوں کے خیالات معلوم کر لئے اور پھر ایسا کام کیا جس سے کفر کا الزام بالکل بے حقیقت ٹھہرا ؟ فقیہوں کے چپ سادھ لینے کی وجہ سے ہجوم نے انہیں بالکل فراموش کر دیا اور مفلوج کو تندرست دیکھ کر ہر کوئی خدا تعالیٰ کی تمجید کرنے لگا۔

مرقس کی انجیل کے اگلے دو ابواب کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے ہی واقعات میں المسیح کی قدرت و اختیار نے شاگردوں کو کس حد تک متاثر کیا۔ وہ ایک ایسا استاد کامل تھا جس کی وہ پیروی کر سکتے تھے اور فی الحقیقت انہوں نے ایسا کیا ! کیا آپ اس قدم کی اہمیت کا تصور کر سکتے ہیں کہ پطرس جیسے محب وطن نے المسیح کے ساتھ محصول لینے والے دشمن رومیوں کے اہلکار لاوی (متی) کے گھر جا کر ان کے ساتھ جنہیں وہ سماج کے روے اور دھتکارے ہوئے سمجھتا تھا بیٹھ کر کھانا کھایا ؟ یسوع کی پرکشش شخصیت' موثر تعلیم' عجیب و غریب معجزات اور لاثانی دعوؤں اور قدرت و اختیار نے انتہائی قلیل مدت میں شاگردوں کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔

شاید المسیح کے حواری اب تک خود اس حقیقت سے باخبر نہیں تھے کہ وہ رفتہ رفتہ اسے اپنی زندگی کا مالک قبول کر رہے' اور ہر ایک بات کے لئے اسی پر انحصار کرنا سیکھ رہے ہیں۔ یسوع المسیح ان کے محسوس کئے بغیر ان کے ظاہر و باطن میں ایک زبردست تغیر پیدا کر رہا تھا۔ اس نے شمعون جیسے وطن پرست اور متی جیسے اہلکار روما کو بھی ایک ہی رسی میں باندھ دیا۔ وہ بہت شائستگی سے اپنے خداوند کی اطاعت میں لگ گئے حالانکہ سرشت کے اعتبار سے وہ ایک

دوسرے کے بالکل متضاد تھے۔ انہوں نے اس روزے کو بالکل نظرانداز کر دیا جو کہ یوحنا اصطباغی اور فریسیوں کے شاگرد اکثر رکھا کرتے تھے (مرقس ۲ : ۱۸)۔ یہاں تک کہ اب وہ سبت کی رسمی پابندیوں کو بھی خاطر میں نہیں رکھتے تھے (مرقس ۲ : ۲۳)۔ نہ جانتے ہوئے بھی وہ حق و باطل کے متعلق نئے نظریات اور خدا اور مذہب کے بارے میں انوکھے تصورات سے متعارف ہو رہے تھے۔

مسیح کے ساتھ شاگردوں کا رویہ اس کی شخصیت پر ان کی پوری شخصیت کا بے ساختہ ردعمل تھا۔ مرقس ۴ : ۳۵ سے ظاہر ہے کہ اب تک ان کا رویہ کس قدر لاشعوری نوعیت کا تھا۔ ایک شام گلیل کی جھیل پار کرنے کی غرض سے وہ یسوع المسیح کے ہمراہ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ کچھ سفر طے کرنے کے بعد جھیل میں اچانک طوفان آگیا جس نے شاگردوں کو بدحواس کر دیا۔ طغیانی کے وقت المسیح کشتی میں پیچھے کی جانب گدی پر سو رہا تھا۔ وہ تمام بلکہ المسیح ان سب سے زیادہ خطرے کا شکار تھا کیونکہ وہ اس طوفان سے بالکل بے خبر سویا پڑا تھا۔ ایسے حالات میں ہم ان سے یہی توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اسے جگائیں اور اسے درپیش خطرے سے آگاہ کریں۔ انہوں نے اسے جگایا تو سہی مگر ساتھ ہی مدد کے لئے چلا اٹھے "استاد کیا تجھے فکر نہیں کہ ہم ہلاک ہوئے جاتے ہیں؟" انہیں توقع نہیں تھی کہ وہ طوفان تھما دے گا جیسے کہ ان کے ڈانواں ڈول اعتقاد سے بالکل واضح ہے۔ البتہ انہوں نے اسے اس لئے جگایا کیونکہ وہ ان کا راہنما تھا اور اس مشکل میں انہیں اس کی راہنمائی کی ضرورت تھی۔ اگرچہ شاگرد اس جھیل میں کشتی چلانے کا تجربہ رکھتے تھے اور ایسے طوفانوں سے بخوبی واقف تھے

جبکہ ان کا استاد ایک پہاڑی گاؤں کا باشندہ تھا' تو بھی وہ اس پر انحصار کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ چنانچہ خطرے میں وہ قدرتی طور پر اس بات کی تصدیق کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ ان کے استاد نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ "اس نے اٹھ کر ہوا کو ڈانٹا اور پانی سے کہا ساکت ہو! تھم جا! پس ہوا بند ہو گئی اور بڑا امن ہو گیا" (مرقس ۴ : ۳۹)۔ یہ غیرمتوقع معجزہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے اور ان پر اس کی بے مثال شخصیت کی ہیبت چھا گئی۔ "وہ نہایت ڈر گئے اور آپس میں کہنے لگے یہ کون ہے کہ ہوا اور پانی بھی اس کا حکم مانتے ہیں؟" (مرقس ۴ : ۴۱)۔ اس بنا پر وہ اسے اپنے سے قطعی جداگانہ ہستی خیال کرنے لگے۔ یہ کہانی نہایت معنی خیز ہے کیونکہ اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ شاگرد کیونکر اپنے آقا پر توکل اور انحصار کرنے لگے تھے۔ اگرچہ ان کا رویہ ابھی لاشعوری تھا تو بھی یہ آہستہ آہستہ ایمان کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا۔

ہمیں اس داستان کی گہرائی میں جانے کی مزید ضرورت نہیں لیکن جو کوئی بھی انجیل جلیل کا بنظر غور مطالعہ کرتا ہے دیکھ سکتا ہے کہ کس طرح یسوع المسیح ان لوگوں کی زندگی بتدریج بدل رہا تھا۔ غیریہودی لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کے علاوہ شریعت کے متعلق بھی ان کے رویے میں تبدیلی آرہی تھی۔ لہٰذا گنہگاروں اور زمانے کے ردے ہوؤں کے بارے میں وہ ایک نیا رویہ اختیار کرنے لگے۔ وہ نیا تصور گناہ حاصل کر رہے تھے۔ المسیح کے بارے میں ان کا یقین رفتہ رفتہ مگر لاشعوری طور پر پختہ ہوتا جارہا تھا۔ پھر ایک دن قیصریہ فلپی کے گاؤں میں یسوع المسیح نے اپنے حواریوں سے براہ راست سوال کیا "تم مجھے کیا

کہتے ہو؟" اس سوال کے جواب کی ضرورت نے ان کے یقین کو واضح اور ٹھوس بنا دیا (مرقس ۸ : ۲۷-۲۹)۔

اب تک ہم نے شاگردوں کو اپنے ایمان و اعتقاد میں بتدریج ترقی کرتے ہوئے دیکھا۔ اب یسوع المسیح کے بارے میں ان کا یہ احساس زور پکڑتا جارہا ہے کہ وہ ان سے قطعی مختلف ہستی کا مالک ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس کی ذات کو پوری طرح جان اور پہچان گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ اگر وہ اس کے سچے پیروکار بننا چاہتے ہیں تو انہیں ماضی کے تمام خیالات و نظریات سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ ان کا یقین تھا کہ وہ رومی حکومت کا تختہ الٹ دے گا اور خود تخت سلطنت پر بیٹھ کر ان پر بادشاہی کرے گا۔ مگر اس کے بجائے ان کے کانوں سے یہ آواز ٹکراتی ہے کہ وہ یروشلیم کو جارہا ہے اور ایک عام مجرم کی طرح مصلوب ہونے والا ہے۔

انہوں نے اس آواز پر کوئی خاص توجہ نہ دی بلکہ کسی حد تک یہ تعلیم انہیں ناگوار لگی۔ اس طرح اب المسیح اور اس کے شاگردوں کے مابین ایک خلیج حائل ہو گئی۔ وہ ابھی تک اسے سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان کا خوف بڑھتا جارہا ہے (مرقس ۱۰ : ۳۲)۔ اس کے باوجود وہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ ہم اس کا مفہوم سمجھنے میں کس قدر نااہل ہیں! معدودے چند لوگ ہی پیدائشی طور پر قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں جبکہ اکثریت دوسروں کی پیروی کرنے پر ہی قناعت کرتی ہے۔ تاریخ انسانی پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حب الوطنی سب سے بڑا جذبہ ہے جو کہ عظیم لیڈر لوگوں کے دلوں میں

پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسی حب الوطنی کے پیچھے عام طور پر کیا چیز کارفرما ہوتی ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ انہیں اپنا مقصد اپنے لیڈر کی ذات میں مجسم صورت میں دکھائی دینے لگتا ہے؟ محکوم قوم آزادی حاصل کرنے کے لئے فقط اسی لیڈر کے پیچھے چلتی ہے جو نہ صرف خود جوشیلا اور شیردل ہو بلکہ اپنی قوم کے دل میں بھی جوش و ولولہ پیدا کر سکے اور غلامی کے جوئے سے نجات دلائے۔ وہ ایسے لیڈر کی پیروی کبھی نہیں کرے گی جو قوم کی زبوں حالی سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو۔

ہم کسی صورت میں بھی ایسے شخص کی پیروی نہیں کر سکتے جس کا نصب العین ہمارے مقاصد سے یکسر مختلف ہو۔ ممکن ہے اس کی اعلیٰ شخصیت کے بموجب ہم بادل نخواستہ اس کی تعظیم بھی کریں مگر حقیقی طور پر ہمارا دل خوف اور نفرت سے ہی بھرا رہے گا۔ یہی سچائی یاد رکھتے ہوئے آیئے ایک بار پھر مرقس کی انجیل کا مطالعہ کریں۔ یہاں آپ کا ایک ایسے لیڈر سے پالا پڑتا ہے جو ایک ٹھوس مقصد کے تحت یروشلیم جانے والا ہے اور اس نے وہ مقصد بالکل واضح کر دیا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر رہا ہے۔ اس کے پیروکاروں کو اس حقیقت کا دیانتداری سے سامنا کرنا ہوگا۔ جب وہ اس کے مقصد کو قبول نہیں کرتے تو وہ سختی سے انہیں ملامت کرتا ہے (مرقس ۸ : ۳۳ - ۳۸)۔ وہ ان کے ارادوں سے بخوبی آگاہ ہے اور وہ خود بھی اپنی دلی کیفیت سے پوری طرح واقف ہیں مگر اس کے سامنے اپنے دل کی گرہ کھولنے سے کتراتے ہیں (مرقس ۹ : ۳۳)۔

یہاں آپ کے سامنے ایک ایسا لیڈر ہے جس کا عزم اپنے پیروکاروں کے ارادوں سے قطعی طور پر متضاد ہے۔ وہ ان کے خیالات سے بخوبی واقف ہے۔ وہ تنہائی کے لمحات میں انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دکھ اٹھا کر موت کا مزہ چکھے گا۔ لیکن یہ باتیں ان کے خیالات سے اس قدر مختلف ہیں کہ وہ انہیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں (مرقس ۹ : ۹، ۳۰ - ۳۱، ۱۰ : ۳۲ - ۴۵)۔ بعض اوقات وہ عام لوگوں کو تعلیم دیتے ہوئے بھی تمثیلوں کی صورت میں اپنی صلیبی موت کی پیش گوئی کرتا ہے (مرقس ۱۲ : ۱ - ۱۱)۔ جب وہ عوام میں کافی مقبول ہو گیا تو ایک روز ہجوم نے بڑے جوش و ولولے کے عالم میں اس پر زور دیا کہ وہ ان کا بادشاہ بن جائے، مگر ------ وہ ایسا کرنے پر رضامند نہ ہوا (یوحنا ۶ : ۱۵)۔ اس واقعہ کے بعد اس کے پیروکاروں کی تعداد رفتہ رفتہ گھٹنا شروع ہو گئی۔

ان بارہ اشخاص کے متعلق غور کریں جو ابھی تک اپنے منصوبوں اور مقاصد کے ساتھ بے دھڑک چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ایسے راہنما کے پیروکار ہیں جس کا نصب العین ان کے مقاصد سے یکسر مختلف ہے۔ حتیٰ کہ ہیکل کے اس واقعے کے بعد جب المسیح نے قیصر روم کو جزیہ دینے کے ضمن میں اپنے رویے سے محب وطن پارٹی کو آخری مرتبہ برہم کیا، یہ پہلے کی نسبت زیادہ واضح تھا کہ ان کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ لیکن وہ پھر بھی اس کی پیروی سے دستبردار نہیں ہوئے۔

یہاں ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال تاریخ انسانی میں ناپید ہے۔

وفاداری اور اطاعت شعاری کی داستان جس کی وضاحت عام انسانی تجربے سے نہیں کی جاسکتی۔ یہاں ہمیں وہ لیڈر نظر نہیں آتا جس میں اس کے پیروکار اپنے مقصد کو حاصل ہوتے دیکھتے ہیں بلکہ یہ لیڈر تو ان کے منصوبوں سے کلیتہً برعکس دکھائی دیتا ہے۔ انہیں تو المسیح کو اپنا دشمن سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرنی چاہئے تھی۔ عوام الناس میں سے وہ جن کی زندگیاں اس کی ذات کے اثر سے بالکل خالی تھیں چلا چلا کر کہنے لگے "اسے صلیب دے، صلیب۔" لیکن یہ بارہ اشخاص جو اس کی شخصیت کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں اور اس سے اور اس کے نصب العین سے خائف ہیں، پھر بھی اس کے مطیع رہتے ہیں۔ کیا اس کے کردار کی قوت اور اس کی شخصیت کے اختیار و قدرت کا اس سے واضح ثبوت مل سکتا ہے؟ اس کے حکم میں کس قسم کا اختیار پایا جاتا تھا جس نے آدمیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ایسے حالات میں بھی اس کی پیروی سے باز نہ آئے؟ یہ وہ اختیار نہیں ہے جو انسان کو دوسرے انسان پر ہوتا ہے۔ اس کی رفاقت و صحابت کے آخری دنوں کے دوران میں جب ان پر یہ حقیقت کھلی کہ اس کے اور ان کے مقاصد میں بین تضاد ہے تو ان کا کردار ابتدائی دنوں کی نسبت جو عجیب و غریب واقعات سے بھرپور تھے زیادہ متاثر ہوا۔ اس صورتحال نے انہیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ اس سے مرعوب ہوئے اور اس رعب کا نتیجہ اس کی پرستش میں نکلا۔

اس کی مصلوبیت نے ان کے خوابوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔ وہ تتر بتر ہو گئے۔ لیکن ان حالات میں بھی اسے فراموش نہ کر سکے۔ فریب نظری اور دل

شکستگی کا صدمہ انہیں مسیح سے دور لے جا سکتا تھا مگر اس کے باوجود وہ اسی کے بندے رہے۔ اگرچہ انہیں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن وہ کبھی اس طرح کی زندگی بسر نہ کر سکتے تھے گویا کہ یسوع کبھی تھا ہی نہیں۔ اب ان کے ذہن میں یہ سوال اور بھی زور سے ابھرنے لگا کہ یہ یسوع کون تھا جس کی پیروی کرنے پر وہ مجبور تھے' باوجود اس کے کہ ان کے اور اس کے مقاصد میں واضح تضاد تھا۔ اگر وہ ایک عام آدمی رہ چکا ہوتا تو شاگردوں کو بے یارومددگار چھوڑنے کے بعد وہ ضرور اس کی تکفیر کرتے اور اس پر لعنت بھیجتے۔

وہ کیا بات تھی جس نے یہوداہ اسکریوتی کو اس کی بیوفائی کا احساس دلایا جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی ؟ ------ جس نے مقدس پطرس کو رلایا کیونکہ اس نے المسیح کا انکار کر دیا تھا ؟ کیا واقعی وہ المسیح کا پیرو کار تھا ؟ کیا وہ ایک ایسا پیروکار نہیں تھا جو بالکل مختلف مقصد رکھتا تھا ؟ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حقیقی پیرو نہیں تھا کیونکہ ان میں سے ہر کوئی اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ دل میں تو جانتے تھے کہ ہم یسوع کے پیروکار ہیں۔ وہ اسے سمجھ تو نہ سکے مگر پھر بھی اس کی پیروی کرنے پر مجبور تھے۔ یہ اس کا ہر انسان سے جداگانہ ذات کا مالک ہونا ہی تھا جس نے انہیں اطاعت کے لئے مجبور کیا۔ اور جب ہم اس کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی نہ کسی صورت میں ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو ہم بھی اس کے پیچھے ہو لیتے۔

باب ششم

مسیحی ایمان کی اصل

یسوع المسیح مصلوبیت کے بعد تیسرے دن مردوں میں سے جی اٹھا۔ قیامت المسیح کو ہم دو ٹوک الفاظ میں تاریخ عالم کا اہم ترین واقعہ کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ یسوع کے ساتھ اس کے شاگردوں کی وفاداری اس کے تمام انسانوں سے جداگانہ ہستی ہونے کی کس قدر شہادت دیتی ہے۔ جن حالات میں وہ اس کے پیرو رہے اگر وہ ان کی مانند محض ایک انسان ہوتا تو ان کا یہ طرزِ عمل بالکل ناقابل توجیہ ہوتا، کیونکہ کسی بھی انسان کو اس کے ہم جنس انسانوں سے ایسی اطاعت و وفاداری نصیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب ہم انجیل جلیل میں پڑھتے ہیں کہ یسوع موت و قبر کے بند کھول کر تیسرے روز مردوں میں سے جی اٹھا تو ہمیں کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ہم قیامت مسیح کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ انجیل کو غیر حقیقی نہیں بناتا بلکہ اس کے بغیر اس کی ساری داستان نامکمل اور ناقابل فہم بن جاتی ہے۔ یہ واقعہ اس سچائی پر جس سے ہم پہلے ہی آگاہ ہیں مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے کہ یسوع تمام انسانوں سے اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

شاگردوں کو یسوع المسیح کے جی اٹھنے کی بالکل توقع نہیں تھی اور نہ وہ

اس کے لئے آمادہ ہی تھے بلکہ یہاں تک کہ وہ اس واقعے پر ایمان لانے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ اور ہمیں ان سے اسی قسم کے رویے کی امید بھی تھی کیونکہ اس سے پیشتر رونما ہونے والی صورت حال نے جو واقعہ تصلیب کے موقعے پر اپنے عروج پر تھی ان کی دنیا کو ابتر کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ مکمل طور پر الجھیڑے میں پھنس چکے تھے۔ وہ یسوع کی گرفتاری تک اپنے مقصد پر ڈٹے رہے کہ اسے اپنا بادشاہ بنائیں۔ اس حقیقت کے روز بروز مزید واضح ہونے کے باوجود کہ وہ دنیاوی بادشاہ بننے کو تیار نہیں وہ اندھادھند اپنے مدعا پر جمے رہے۔ اس سے بچھڑ جانے کے بعد ہی انہیں اس حقیقت کا احساس ہوا کہ یسوع نے ان کی زندگی میں ان کے دنیاوی مدعا سے کہیں اہم مقام حاصل کیا ہوا تھا۔ یہی وہ احساس تھا جو یہوداہ اسکریوتی کو خودکشی کی جانب لے گیا ـــــ اسی نے پطرس کے دل پر چوٹ لگائی کہ وہ زار زار رویا۔ لیکن اس ساری حقیقت کو وہ ابھی تک نہیں سمجھ پائے تھے۔ تب یسوع مردوں میں سے جی اٹھا اور اس کے ساتھ ہی ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔

اس سب کچھ سے کیا مراد ہے؟ یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ بعض لوگ قیامت مسیح کے منکر ہیں۔ لیکن انہیں یہ مشکل درپیش ہے کہ تاریخ کے ایک ایسے واقعہ کی تردید کیوں کر کریں جس کی نہایت قوی دلیلوں سے تصدیق ہوئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟

۱۔ قیامت المسیح پر سب سے عام اعتراض یہ ہے کہ "کیا ایک مرا ہوا شخص پھر زندہ ہو سکتا ہے ؟" معمولی سا غور و فکر بھی یہ ظاہر کر دے گا کہ خداوند

مسیح کے مردوں میں سے جی اٹھنے کے سلسلے میں یہ اعتراض کس قدر لغو اور بے معنی ہے۔ دراصل پہلی بات تو یہ ہے کہ قیامت المسیح کی سچائی کو قبول کرنے والوں میں سے کوئی بھی یسوع کو محض ایک انسان نہیں سمجھتا' جبکہ معترضین کے ہاں اس کی حیثیت ایک انسان سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اعتراض یا سوال کا ایمانداروں کے ایمان و ایقان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معترضین کے ذہن میں یہ ہے کہ مسیح ویسی ہی زندگی جارہی رکھنے کے لئے جی اٹھا جیسی کہ موت سے پیشتر اس کی تھی۔ لیکن درحقیقت جی اٹھے مسیح کی جسمانی کیفیت پہلے سے مختلف تھی۔

۲۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ "یسوع صلیب پر موا نہیں تھا بلکہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسی حالت میں اسے دفن کر دیا گیا۔ بعدازاں جب اسے ہوش آئی تو وہ قبر کی اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آیا۔" خیر یہ لوگ کم از کم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ قبر خالی ہے اور یہ بھی کہ مصلوبیت مسیح اس کے مشن کا خاتمہ نہیں تھا۔ لیکن انہیں اپنے اس نظریے کی وجہ سے متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے وہ جس قدر زیادہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اسی قدر ان میں الجھتے جاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ شاگردوں کا رہنما لوٹ آتا ہے مگر کیسے ؟ اس حیران کن نظریے کے بعض حامی بیان کرتے ہیں کہ یسوع بعداز مصلوبیت اسی (۸۰) برس تک اس دنیا میں زندہ رہا۔ لیکن کیسے ؟ وہ جس نے تاج و تخت سے انکار کر کے صلیب کو قبول کر لیا تھا' اسے مطلوبہ موت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ جو ہر صورت حال پر قادر تھا اور جس پر اس کے شاگرد

مکمل طور پر انحصار کرنا سیکھ چکے تھے' اب ایک ناقابل اعتماد شخص بن جاتا ہے۔ وہ ایک قبر سے نکل کر گویا دوسری قبر میں داخل ہو گیا' جہاں سے نکلنے کی وہ جسارت نہیں کرتا۔ وہ زندہ درگور ہونے کی خاطر اجل سے بھاگ نکلتا ہے اور اس کے بعد سے اس کی زندگی چلتی پھرتی موت بن جاتی ہے۔ وہ جو اپنے دشمنوں کے سامنے آنے سے کبھی نہیں گھبرایا تھا اور جس نے موت کو گلے لگانے کے لئے یروشلیم جانے پر کمر باندھ رکھی تھی' اب روپوش زندگی گزارتا ہے یا کشمیر کی جانب بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور وہیں بعداز طبعی موت دفن ہوتا ہے۔ اگر حقیقت حال یہی تھی تو ہم مسیح کے لئے کلیسیا کی پرجوش محبت اور والہانہ وفاداری کی جو واقعہ تصلیب کے بعد کی تاریخ سے ظاہر ہے کیونکر توضیح کر سکتے ہیں ؟ اگر وہ ان کی نظروں سے اوجھل تھا' بھگوڑا تھا یا انہیں ترک کر گیا تھا تو ان کا زندگی کو خطرات میں ڈالنے اور یہ بتانے کے لئے کہ یسوع ہی خداوند اور المسیح ہے' اور موت کو قبول کرنے کی ہم کیسے تشریح و توجیہ کر سکتے ہیں ؟ اس نظریے کے مطابق اگر یہ سچ ہے کہ یسوع نے صلیب پر جان نہیں دی تھی تو عوام کے سامنے شاگردوں کے اس دعوے کی کہ "ہم مسیح کے جی اٹھنے کے گواہ ہیں" کیا تفسیر ہو سکتی ہے ؟ اگر اس نے فی الواقع ایسی ہی زندگی گزاری تو وہ روئے زمین پر سب سے زیادہ قابل رحم شخص تھا۔ وہ اثر و رسوخ جس نے اس کے پیروکاروں کی وفاداری کو اکسایا تھا پاش پاش ہو جاتا اور تمام منصوبے جنہیں یسوع نے اپنی حیات میں پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ٹھان رکھی تھی نامکمل ہی رہتے۔ اس قسم کی شخصیت فقط ایک حواس باختہ اور خبطی دنیا میں ہی ایسی

اطاعت و فرمانبرداری حاصل کر سکتی ہے۔

۳ - کچھ قدرے استدلال کے ساتھ یہ کہتے ہیں "یہ جھوٹ ہے کہ یسوع مردوں میں سے جی اٹھا۔ یہ شاگردوں کا محض تخیل تھا کہ یسوع ان پر ظاہر ہوا ہے اور انہوں نے اسے دیکھا ہے۔ ایسی محبت جیسی کہ ان میں موجزن تھی ان کے محبوب یسوع کے ساتھ نہیں مر سکتی تھی' لہٰذا اسی محبت نے تمام غم و اندوہ پر فتح پاتے ہوئے وجد آور رویاؤں اور خوابوں کو جنم دیا۔ ان کے نزدیک یہ رویائیں حقیقت پر مبنی تھیں۔ ان کے خیال میں وہ فی الحقیقت یسوع ہی کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن ہمارے لئے اس دعوے کو قبول کرنا کہ انہوں نے یسوع کو دیکھا اور یہ کہ وہ جسمانی طور پر بنفس نفیس موجود تھا' غیر معقول اور بعید القیاس ہے۔" اس نظریے میں قدرے معقولیت پائی جاتی ہے۔ اب ہم یقیناً سمجھ سکتے ہیں کہ یسوع کو اپنے سامنے دوبارہ دیکھنے پر اس کے شاگرد محبت اور غم کی ملی جلی کیفیت سے کس قدر مغلوب تھے۔ علاوہ بریں جب کوئی ایک مرتبہ رویا دیکھ لیتا ہے تو ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ تاہم یہ نظریہ معقول ثابت ہونے کے بجائے آغاز ہی میں فیل ہو جاتا ہے۔

ایسی تمام " رویائیں " اس خصوصیت کی حامل ہیں کہ وہ اس شخص کو جو ان کا موضوع ہوتا ہے بالکل اسی طرح پیش کرتی ہیں جیسے کہ ہم اسے پہلے سے جانتے ہیں۔ اس کی وضع قطع اور رویہ بھی ہمارا جانا ہوا ہوتا ہے۔ رویا میں دکھائی دینے والی شخصیت کو فی الفور پہچان لیا جاتا ہے جیسے کہ ہم اسے پہلے ہی سے جانتے ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ پہلے ہوا کرتا تھا اب بھی وہی ہے۔ ہم اسے

شناخت کرنے کے ضمن میں غلطی نہیں کھا سکتے' یہ وہی ہوتا ہے کوئی دوسرا نہیں۔ اب انجیل جلیل میں مندرج شاگردوں کے تجربات پر اچٹتی سی نگاہ ڈالنے سے فوراً" واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تجربات قطعی مختلف نوعیت کے تھے۔ شاگردوں کو دکھائی دینے والے یسوع کو انہوں نے شروع شروع میں نہیں پہچانا۔ وہ ویسا نہیں تھا جیسا کہ وہ اسے پہلے سے جانتے تھے۔ انہوں نے اسے اس وقت تک نہ پہچانا جب تک کہ انہوں نے اس کی آواز نہ پہچانی یا انہوں نے اس کی کوئی مانوس حرکت نہ دیکھی (یوحنا ۲۰ : ۱۴' ۲۱ : ۴' لوقا ۲۴ : ۱۶)۔ اب دکھائی دینے والا یسوع پہلے سے کچھ مختلف تھا اور رویا کے کسی بھی نظریے سے اس بات کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ تاہم مزید یہ کہ انہیں نظر آنے والا یسوع وہ نہیں تھا جو کہ ان کے ذہنوں میں تھا۔ یہ وہ "ابن آدم" نہیں تھا جس کے پاس "سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں" تھی' بلکہ یہ "جلالی یسوع" تھا اور شاگردوں کا ردعمل اس کا ثبوت تھا۔ ہم ان کے جی اٹھے مسیح کے تجربے کی توضیح یہ نہیں کر سکتے کہ اس کے لئے ان کی محبت تمام رنج و ملال پر غالب آگئی بلکہ ان کے ہم نوا ہم بھی یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ یسوع نے موت اور قبر پر فتح حاصل کی۔

قیامت المسیح کی کوئی اور تشریح نہیں کہ جا سکتی۔ اسے اسی طرح قبول کرنا پڑتا ہے جیسے کہ یہ حقیقت میں ہے یعنی کہ تاریخ عالم کی اہم ترین صداقت کے طور پر !عہدنامہ جدید میں موجود "رسولوں کے اعمال" نامی کتاب کا مطالعہ کرنے والے پر واضح ہو جاتا ہے کہ شاگردان مسیح کی زندگیوں میں کس قدر

عظیم تبدیلی رونما ہوئی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کتاب میں مندرج ابتدائی کلیسیا کے حالات و واقعات پر پوری طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم شاگردوں (یا جنہیں اب رسول کہنا چاہئے) کے ان وعظوں کا جو انہوں نے لوگوں کے سامنے کئے، کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو باتیں آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ یسوع کے جی اٹھنے کی منادی کرتے ہیں اور دوسری یہ کہ اس بادشاہت کا کوئی ذکر نہیں ملتا جس کا اناجیل میں بار بار ذکر ہوا تھا۔ یہ دونوں حقائق اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان پر فردا" فردا" غور و خوض کیا جائے۔ وہ جس جی اٹھنے کی منادی کرتے تھے وہ کس قسم کا تھا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کسی شخص کا بعد از موت پھر انسانی زندگی اختیار کر لینا نہیں تھا۔ "... خدا نے موت کے بند کھول کر اسے جلایا کیونکہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس کے قبضے میں رہتا" (اعمال ۲ : ۲۴)۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ المسیح نے مردوں میں سے زندہ ہو کر موت پر فتح پائی ہے۔ "... خدا نے اسی یسوع کو جسے تم (اسرائیل) نے مصلوب کیا خداوند بھی کیا اور مسیح بھی" (اعمال ۲ : ۳۶)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت مسیح کسی بشر کا مرنے کے بعد از سرنو زندگی پانا نہیں بلکہ اس کا مطلب قدرت اور جلال سے بہرہ ور ہونا ہے۔ قیامت المسیح جس کی حواری منادی کرتے تھے ان کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی اور یہ بات اس حقیقت سے بھی عیاں ہے کہ ان کے پیغام میں خالی قبر کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یسوع کے پیروکار مسیح کی قبر کا موازنہ داؤد نبی جن کی "قبر آج تک ہم میں موجود ہے" (اعمال ۲ : ۲۹) کی قبر سے کرتے ہیں۔ ان کی زندگی پر قیامت المسیح کا اثر اس قدر

قوی تھا کہ یہ ان کی منادی کا ایک مرکزی عقیدہ بن کر رہ گیا۔ جی اٹھنے کے باعث خدا نے یسوع کے کام پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ شاگردوں نے اس کی پیروی کر کے بالکل درست قدم اٹھایا تھا۔ اب بالاخر ان پر حقیقت کھل گئی۔ لیکن یہ قدرتی بات تھی کہ پہلے پہلے وہ المسیح کے جی اٹھنے کے تجربے سے یہاں تک مغلوب ہوئے کہ شروع شروع میں یہی ان کے خیال اور کلام پر حاوی تھا۔

یوحنا اصطباغی کی منادی یہ تھی کہ " آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے" اور یسوع نے بھی اپنی تعلیمی خدمت کے آغاز میں اسی کی منادی کی۔ البتہ یہ واضح ہے کہ اس کے نزدیک اس بادشاہی کا مرکز و محور اس کی اپنی ذات تھی۔ جب اس نے اپنے شاگردوں کو عوام میں بھیجا تو انہیں آسمان کی بادشاہی کی منادی کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس حقیقت سے قطعاً بے خبر تھے کہ یسوع کے ہاں اس بادشاہی کا مفہوم وہ نہیں تھا جو کہ وہ سمجھ رہے تھے۔ لیکن اب وہ اس بادشاہت کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ کوئی مشکل ہی سے اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ یہ کوتاہی اور غفلت جان بوجھ کر کی گئی تھی۔ دراصل سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے بادشاہت کی جگہ بادشاہ کی منادی کی۔ اور یہ انہوں نے لاشعوری طور پر کیا ہوگا۔ ماضی کا المیہ یہ تھا کہ ان کی وفاداریوں کے مابین تصادم تھا------ یسوع سے وفاداری جس کی انہوں نے پیروی کرنا تھی باوجود اس کے کہ اسے ان کے خیالات و نظریات سے کوئی ہمدردی نہیں تھی' اور بادشاہی سے وفاداری جس کی بدولت وہ ہمہ وقت رنگین خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہتے تھے۔ بالاخر

انہیں افسوس ناک انجام کا منہ دیکھنا پڑا جس نے ان کی فریب نظری کا ازالہ کر دیا۔ اب وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہے تھے جس میں ان دو وفا داریوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے وہ بادشاہت حاصل کر لی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بادشاہ اور بادشاہت ایک ہو گئے تھے۔ یسوع نے اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی اور اب ان پر یہ بھید کھل گیا تھا۔ یوں ان کی یسوع کی منادی درحقیقت بادشاہت کی ہی منادی تھی۔

المسیح کی وہی یکتا ذات جس نے انہیں شروع میں اس کی اطاعت پر مجبور کیا تھا' اب اس کے بارے میں ان کے ذہن اور دل روشن ہو جاتے ہیں اور اب وہ بخوشی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ انہیں یسوع سے ایسی محبت تھی جو تمام حالات پر غالب آگئی تھی۔ لیکن اب یہی محبت مسیح پر ان کے ایمان میں حقیقی طور سے ظاہر ہو گی۔ تاہم ابھی تک وہ اپنے تجربے کا مفہوم نہیں سمجھ پائے۔ ان میں دور حاضر کی طرح کوئی مرتب و مدون عقیدہ رائج نہیں تھا' البتہ ان کے طرزعمل اور رویے سے وہ سب کچھ ظاہر تھا جس نے بعد میں الفاظ کا روپ دھارنا تھا۔ زندہ مسیح پر ایمان اب نجات کی شرط ہے (اعمال الرسل ۲ : ۳۸' ۳ : ۱۶' ۴ : ۱۲)۔ اسی ایمان کو اب قوت کا بھید کہا جاتا ہے۔ نیز سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ یسوع سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ کوئی بھی غیر مسیحی اپنے رسول یا پیغمبر سے دعا کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بات کس قدر عجیب اور معنی خیز ہے کہ یسوع کے ابتدائی پیروکار اس سے دعائیں مانگتے ہیں۔ ہم انسان کے لئے اور خداتعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ وہ توحید

پرست یہودی تھے اور اولیاء پرستی کی تمام صورتوں سے سخت متنفر تھے۔ اس کے باوجود مقدس ستفنس اپنی شہادت کے موقع پر یسوع المسیح سے دعا کرتے ہوئے کہتا ہے' "اے خداوند یسوع! میری روح کو قبول کر.... اے خداوند' یہ گناہ ان کے ذمہ نہ لگا" (اعمال ۷ : ۵۹ - ۶۰)۔ مسیح کے یکتا ہونے کا احساس جو انہیں اس کی جانب کھینچ لایا تھا اس قدر شدید تھا کہ وہ اس کی مزاحمت نہ کر سکے۔ اس نے ان میں پر تعظیم خوف پیدا کر دیا تھا اور اب وہی احساس یسوع کی پرستش کی صورت میں اپنا برجستہ اظہار کرتا ہے۔ الوہیت مسیح کی قائلیت ان کے تجربے سے ابھری۔ اسی تجربے کی بعد میں مسیحی عقیدے میں وضاحت ہوئی۔

بلاشبہ کچھ وقت گزرنے پر کلیسیائی اعتقادات کو "اقرار الایمان" میں معقول و مربوط انداز سے ظاہر ہونا واجب تھا۔ اپنے ایمان کے حقیقی اور کامل مفہوم تک سب سے پہلے پولس رسول اور یوحنا رسول کی ہی رسائی ہوئی۔ یہاں ہم مسیحی اعتقاد کے ارتقا پر غور و فکر نہیں کریں گے بلکہ یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ تجربے کا عقیدے کی صورت اختیار کر لینا کس قدر ناگزیر تھا۔ وہ اشخاص جو پہلے پہل گر کر یسوع کی پرستش کرنے لگے یہودی تھے۔ وہ خدا تعالیٰ کی تعظیم و تکریم کے ضمن میں نہایت غیور اور کٹر توحید پرست تھے۔ وہ یہودی ایمان میں پل کر جوان ہوئے تھے اور بچپن ہی سے ان کے دل میں شریعت کے لئے اس قدر عزت تھی کہ اسے خدا کی پاک مرضی کا اظہار سمجھا جاتا تھا۔ ان کی دانست میں انسان کی نجات کے لئے خدا کا تجویز کردہ فقط یہی

ایک رستہ تھا۔ وہ شریعت کی قدر و افادیت کے سلسلے میں شک و شبے کا بالکل شکار نہیں تھے' باوجود یہ کہ اس نے انہیں اس قابل نہیں بنایا تھا کہ وہ مطلوبہ نجات پاسکتے۔ فریسی یہ تعلیم دیتے تھے کہ خدا کی برگزیدہ امت (یہودی) اگر ایک ہی دن کے لئے شریعت پر پورا پورا عمل کر لے تو مسیح موعود کی آمد ممکن ہو جائے گی۔ شریعت انسان کو بچانے میں ناکام رہی تھی' لیکن وہ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ملزم ٹھہرا کر شریعت کو بے قصور قرار دیتے تھے۔ شریعت گناہ کو نہیں مٹا سکی تھی اور دکھائی یوں دیتا تھا کہ گناہ ہی مسیح موعود کی آمد میں تاخیر کا موجب ہے۔ فریسیوں کی یہی تعلیم نجات دلانے میں شریعت کی ناکامی کا بین ثبوت تھی۔

پولس کی طرح متعدد افراد شریعت پر عمل کرنے کے سلسلے میں نہایت سرگرم تھے مگر بعدازاں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شریعت انہیں ہرگز نہیں بچا سکتی۔ پولس رسول نے روم کی کلیسیا کے نام کے خط کے باب ہفتم میں شریعت کے بارے میں اپنے تجربے سے جو کچھ لکھا ہے' شریعت پرستانہ مذہب کی ناکامی کے ضمن میں اس سے واضح بیان دنیا کے تمام لٹریچر میں ناپید ہے۔ شریعت اگرچہ خداتعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی مگر گنہگار انسان کو بچانے کی صلاحیت سے محروم ہی رہی۔ اور یہ پہلی اہم اور قابل غور سچائی ہے۔ دوسری سچائی یہ ہے کہ جہاں شریعت ناکام رہی وہاں یسوع کو کامیابی حاصل ہوئی۔ پولس رسول جیسے کٹر شرع پرست بھی شریعت پر عمل کرنے کے باوجود نجات سے ناامید و نامراد رہے۔ انہیں فقط یسوع کی بدولت ہی گناہ کے بندھن سے آزادی نصیب ہوئی

اور اسی رہائی کا نام نجات ہے۔ اسی تجربے نے انہیں لازماً" یہ دریافت کرنے پر اکسایا کہ یہ شخص یسوع کون ہے؟ ان کی مشکل کو حل کرنے کے دوران اس کی ذات ان کے لئے ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی۔ کیا واقعی ایک انسان سے بڑھ کر اس کی کچھ حیثیت نہ تھی؟

یہودیت کو چھوڑ کر دائرہ مسیحیت میں داخل ہونے والوں کو جس مسئلے کا سامنا تھا اسے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں : خدا نے شریعت عنایت فرمائی مگر وہ انسان کو بچانے میں ناکام رہی۔ تاہم جہاں شریعت ناکام ہو گئی وہاں یسوع نے کامیابی حاصل کی۔ اگر یسوع انسان تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں خدا ناکام رہا وہاں ایک انسان کامیاب و کامران نکلا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی بھی سچا خداپرست شخص اس امکان کا تصور کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ تب اس مسئلے کا صرف اور صرف ایک ہی حل ہو سکتا تھا کہ "خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر لیا" (۲۔کرنتھیوں ۵ : ۱۹)۔ ان کے تجربے کا واحد نتیجہ اسی عقیدے کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ نیز اس اعتقاد و قائلیت کا لفظی صورت اختیار کر لینا وہی کچھ تھا جس کا پہلے ہی پرستش کی صورت میں اظہار ہو چکا تھا۔

اس بات پر غور کرنے سے پہلے کہ یہ عقیدہ آج ہمارے لئے کیا جواز رکھتا ہے، شاید کچھ وقت کے لئے ان دو اعتراضات پر غور و خوض کرنا چاہئے جو یسوع سے متعلق مسیحی ایمان کی تاریخی بنیادوں پر کئے جاتے ہیں۔ اگر یسوع الٰہی ذات تھا تو دنیا میں اس کی آمد اور انسانی جسم اختیار کرنا فقط ایک عام تاریخی

واقعہ ہی نہیں تھا بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہ غیرفانی کا عالم فانی میں داخل ہونا تھا۔ لیکن اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ شاگردان مسیح اور ابتدائی کلیسیا تجسم پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور اس عقیدے سے بھی قطعی ناآشنا تھے کہ مسیح ازل سے ہے۔ شاگردوں کے ایمان و عمل کو نظرانداز کرنے پر ہی یہ اعتراض قائم رہ سکتا ہے۔ جیسے کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں کہ عقیدہ مرتب ہونے سے پہلے الوہیت مسیح ان کا تجربہ تھی۔ اس سے قبل کہ انہوں نے اپنے تجربے کی تفسیر کرنا شروع کی وہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن یہ لازم تھا کہ تجربے ہی سے عقیدہ جنم لیتا۔ پس یہ اعتراض بیکار و مہمل ٹھہرتا ہے۔ جہاں تجربہ مسیح کی الٰہی ذات ہونے پر اصرار کرتا ہے وہاں عقل و خرد اس کی ازلیت پر زور دے گی۔ ازلی ہونا الوہیت کا وصف ہے اور ازلیت اگرچہ عالم فانی میں داخل ہو سکتی ہے مگر یہ خود فنا نہیں ہو سکتی۔

اگر مسیح کے الٰہی ذات ہونے کا عقیدہ شاگردوں اور ابتدائی کلیسیا کی فریب نظری یا پریشان حال ذہنوں کی پیداوار ہوتا تو یہ اتنی دیر تک کبھی زندہ نہ رہتا۔

سچ تو ہے کہ مسیحی عقیدہ ابتدا ہی سے تجربے کی حقیقت سے وابستہ رہا ہے۔ یسوع کو مردوں میں سے جلا کر خدا تعالیٰ نے اس پر اپنی تصدیق کی مہر لگا دی ہے۔ جس وقت شاگردوں کے ذہنوں میں یہ تجربہ ابھی اس قدر تازہ تھا کہ وہ پوری طرح سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ یہ کتنا دور رس مفہوم کا حامل ہے' وہ انسانی تاریخ میں خدا کی مداخلت کی منادی کرنے لگے : "پس اسرائیل کا سارا

گھرانا یقین جان لے کہ خدا نے اسی یسوع کو جسے تم نے مصلوب کیا خداوند بھی کیا اور مسیح بھی" (اعمال ۲ : ۳۶)۔

مسیحی ایمان کے نقطہ آغاز کے بارے میں جاننے کے لئے خواہ ہم کسی بھی زاویے سے دیکھیں' اس کا سراغ شاگردوں کے تجربے میں ہی ملے گا۔ المسیح کے الٰہی ذات ہونے کا عقیدہ تجربے کی بنا پر پیدا ہوا اور مسلسل تجربے کے باعث یہ تمام حملوں کے باوجود قائم رہا اور تجربے کی وجہ سے یہ آج بھی زندہ ہے۔ گناہ معاف کرنے کا اختیار خدا کو ہی حاصل ہے۔ عقل سلیم ہمیں اس حقیقت کو ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ المسیح گناہ معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اس کی تصدیق ہمارا تجربہ کرتا ہے کہ وہ واقعی الٰہی ذات ہے۔ چنانچہ اس نتیجے سے راہ فرار ممکن نہیں۔ لیکن یہ نتیجہ فقط وہی قبول کر سکتا ہے جس کے اپنے تجربے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

مسیحیّت کی بُنیاد کسی کتاب پر نہیں بلکہ ایک
زِندہ جاوید شخصیّت پر ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں یہ
دِکھایا گیا ہے کہ تین ۳ برس تک یسوعؔ المسیح کی رفاقت و
صحابت میں رہتے ہُوئے کِس طرح اُن کے حواریوں
کا یہ اِیمان جڑ پکڑتا گیا کہ دُنیا کے نجات دِہندہ وُہی
ہیں۔ یُوں المسیح کی بے مثال شخصیّت کا قرِیبی مشاہِدہ
ہی مسیحی عقیدے کی تشکیل کا مُوجب بنا۔ زیرِنظر کتاب
کا مُطالعہ قاری کو یسُوعؔ المسیح کی پُراسرار شخصیّت
پر اَز سرِ نَو غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

896 3509